لہ دعوۃ الحق
قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دارالعلوم ۔۔۔ ۴ | فون نمبر رہائش ۔۔۔ ۲

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر: ۷ | مدیر | ربیع الثانی/جمادی الاول ۱۳۹۲ھ
شمارہ نمبر: ۹ | سمیع الحق | جون ۱۹۷۲ء

اس شمارے میں

ناشر: سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ ۔۔۔ مقام اشاعت: دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
طابع: منظور عام پریس پشاور ۔۔۔ پرنٹر: محمد شریف ۔۔۔ کتابت: اصغر حسن

مغربی و مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸/ روپے | فی پرچہ ۷۵ پیسے | غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ ہوائی ڈاک دو پونڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

قومی اسمبلی میں عبوری آئین پر بحث کے دوران علماء کے مختلف مکاتبِ فکر نے متفق ہو کر پورے شد ومد کے ساتھ مطالبہ کیا کہ آئین میں جہاں ملک کی صدارت اور دیگر کلیدی آسامیوں کے لئے مسلمان کا ہونا لازمی قرار دیا جائے وہاں مسلم کی تعریف بھی ہونی چاہئے کیونکہ کسی چیز کی ماہیت اس کی جامع اور مانع تعریف ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔ مسلمان قوم کی ایک مستقل تشخص ہے جو اسے دوسری اقوام اور ملل سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی انفرادی اور امتیازی تشخص ہی دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تشکیلِ پاکستان کا ذریعہ بنا ہے۔ اور آج بھی کوئی اسلامی مملکت اور مسلم قوم اپنے وجود کو صرف اس صورت میں برقرار رکھ سکتی ہے کہ وہ ایک واضح اور غیر مبہم مفہوم کے ذریعہ مار آستین اسلام نما ملحدوں اور کافروں سے اپنی ملت کی حفاظت کر سکے۔ برصغیر پاک و ہند کی مختلف الاقوام حیثیت پھر موجودہ حالات میں پاکستان کی نزاکتیں اس مطالبہ کو ایک جائز اور معقول مطالبہ قرار دیتی ہیں۔ مگر حزبِ اقتدار نے جس زور شور سے اس مطالبہ کو مسترد کرنا چاہا اسکی کوئی مناسب وجہ بجز "مرزائیت نوازی" اور الحاد پروری کے اور سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر وہی ہوا کہ چور کو داڑھی کا تنکا نظر آنے لگا۔ اور مرزائیوں نے اور کسی حد تک منکرینِ حدیث پرویزیوں نے حکومت کے اختیار کردہ موقف پر خوشی اور مسرت کا طوفان اٹھایا۔ آج ان لوگوں کے پریس پر سطحی نظر ڈال کر بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس مطالبہ پر مرزائی جتنے بھی سیخ پا ہوں گے اور پرویزی یا منکرِ خدا اور رسول کمیونسٹ جتنی ناگواری ظاہر کریں گے اتنی ہی اس مطالبہ کی معقولیت اور گہرائی و دوررسی ظاہر ہوتی چلی جائے گی۔ جس سے اسمبلی کے حزبِ اقتدار نے محترم وزیرِ اطلاعات کی قیادت میں علماء کے باہمی اختلاف کی آڑ میں فرار اختیار کرنا چاہا، مگر علماء کی متفقہ پیش کردہ تعریف نے آئینی کمیٹی کیلئے یہ راستہ بھی مسدود کر دیا ہے۔ تعجب تو مرزائی گروہ پر ہے جو ایسے مطالبات کو مسلمانوں میں تفرقہ انگیزی سمجھ رہا ہے جب کہ اس گروہ کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی نے اسلام کے قلعۂ اتحاد ختمِ نبوت میں شگاف ڈالنے کی ناکام سعی کی اور مسلمانوں میں اختلاف و انتشار اور نفاق کا بیج ڈالنے کیلئے ایک مستقل مذہب کھڑا کیا۔ اسلام اور کفر کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے پر یہ لوگ چلا رہے ہیں، جب کہ ان کے پیرو مرشد متنبی کذاب قادیانی نے اپنے نہ ماننے والوں کو قطعی کافر، مرتد، جہنمی اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا، خواہ کسی نے اس کا نام تک بھی نہ سنا

ہو وہ اولئک ھم الکافرون حقاً کا مصداق بنایا جو اپنے نہ ماننے والے تمام عالم اسلام سے
معاشرتی ازدواجی تعلقات قائم کرنا حرام سمجھتا ہو، اور جو لوگ اس "جرم انکار" میں بانیٔ پاکستان
مسٹر جناح کو بھی مستحق جنازہ و دعا نہ سمجھتے ہوں، جو گروہ اپنے دائرہ میں اپنے پیروؤں کے لئے
ایک مستقل دین، مذہب اور انفرادی و امتیازی خصوصیات اور تشخصات کا طلبگار رہا ہو۔ (ملاحظہ
ہو مرزا قادیانی اور ان کے خلفاء وغیرہ کی تصانیف رسائل الفضل، آئینہ صداقت، کلمۃ الفصل وغیرہ،
مرزائی لٹریچر) ستم بالائے ستم مرزائیوں کے لاہوری ٹولہ پہ ہے جو آج اس واویلا میں قادیانیوں کا
ہمنوا ہے۔ اگر وہ صرف کلمہ کہنے کو اسلام کا سرٹیفکیٹ سمجھتا ہے تو پھر وہ خود کس بنیاد پہ قادیانیوں
کو کافر قرار دیتا ہے اور قادیانی انہیں کیوں دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

اس وقت مرزائیت کا فتنہ جس انداز میں مسلمانوں اور بقایا پاکستان کے لئے خطرہ کا الارم
بنا ہوا ہے۔ اس شجرۂ خبیثہ کے ہاتھوں مستقبل میں جو خطرات پاکستان کو درپیش آسکتے ہیں ہم اس
پہ بہت کچھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں بہت سے درون خانہ اسرار و رموز کا علم ہے۔ اگر خدا نے اس بے بس
ملک پر خاص نگاہ کرم نہ فرمائی تو سازشوں کے شکار ہونے کا خطرہ یقین سے بدل سکتا ہے۔ دفاعی
نقطۂ نظر سے ہم دن بدن ان لوگوں کے رہین منت بنتے جا رہے ہیں جو عقیدتاً جہاد کو حرام سمجھتے اور
اس ملک کے باشندوں کو قطعی کافر سمجھتے ہیں۔ اقتصادیات میں ان کے عمل دخل کے نتیجہ میں ملک دو
ٹکڑے ہوا۔ ایم ایم احمد ہی کی وجہ سے دونوں صوبوں کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھتی رہی۔ معاشی لحاظ سے
ملک دیوالیہ ہوا۔ سیاسی عیاریوں کی یہ حالت کہ ایک طرف استعماری اور سامراجی اغراض کی خاطر ہمیں کاسۂ
گدائی لیکر یورپ کی دریوزہ گری پہ مجبور کر دیا گیا، ملک پہ اربوں روپے کا بوجھ لدتا چلا گیا۔ دوسری طرف
چینی سفیر بذات خود ربوہ کی یاترا کرنے جا رہا ہے، روس کا فرسٹ سیکرٹری خفیہ طور پر ربوا جا چکا ہے۔
خلیفہ سے خفیہ مذاکرات ہو رہے ہیں۔ مگر پریس میں نہ تو اس بارہ میں کوئی خبر شائع ہوتی ہے، نہ مرزائی
اسے مصلحتاً ظاہر کرنے دیتے ہیں، جبکہ چین آزادی اور حریت کا دعویدار ہے اور ربوہ سامراجی اور صیہونی
سازشوں کا اڈہ۔ باخبر لوگ اس "اجتماع ضدین" پر محو حیرت ہیں۔ کیا یہ سب کچھ زیر زمین کسی سازش
کی غمازی نہیں کرتا۔ حکومت ان سب باتوں سے باخبر ہوگی مگر نوٹس تو کیا باہمی عہد و پیمان کا سلوک ہے۔
کہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے ارکان مرزائیت کو کفر سے بچانے کے لئے اسمبلی میں ایڑی چوٹی
کا زور دکھانا چاہتے ہیں۔ ادھر مرزائی کن کن طریقوں سے اس احسان کا صلہ چکائیں گے ۔۔۔؟ اخبارات میں

آچکا ہے کہ لائل پور کے انتخاب میں پیپلز پارٹی کے افضل رندھاوا کے حق میں بکس ووٹ "بھگتانے کے لئے ربوہ سے بھاری تعداد میں عورتیں آئی تھیں۔ (جنگ یکم جون ۱۹۷۲ء) ان عورتوں کو ایک عورت کے مقابلہ میں پی پی پی کے نمائندہ سے دلچسپی تھی تو کیوں — ؟ یہ سب باتیں قوم کے لئے لمحۂ فکریہ ہیں۔ اور ملتِ مسلمہ کے شجرۂ طوبیٰ کے لئے یہ آکاش بیل دن بدن خطرۂ ہلاکت بنتا جارہا ہے ایسے حالات میں اگر اسلام اور کفر کے درمیان حدِ فاصل کھینچنے کے لئے آئین میں "مسلم" کی واضح حیثیت ظاہر کرانے پر زور دیا جاتا ہے تو آئینی کمیٹی اور پورے ایوان کو بجائے مخالفت کے اس ملک کے مفاد میں اس کا خیر مقدم کرنا چاہئیے، مرزائیت اور اسلام کے الگ الگ تشخص آج کا مسئلہ نہیں ہمارے نقاد و بصیر مفکر علامہ اقبالؒ نے اس وقت بھی ان خطرات کو محسوس کرکے واضح طور پر مسلمان کی تعریف پہ زور دیا تھا جبکہ اس کی ہلاکت آفرینی اس حد تک نہیں پہنچی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ :

> "اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کی حدود مقرر ہیں۔ یعنی وحدت الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسولِ کریم کی ختمِ نبوت پر ایمان —— دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے کہ کوئی فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ (حرفِ اقبال ص۱۳۴)

اس دجل و تلبیس اور ملت کو اضطرابی کیفیت اور ارتیاب و نفاق کے خطرات سے نکالنے کا علاج بھی علامہ اقبالؒ نے ہی بتلا دیا تھا کہ :

> "میرے سامنے قادیانیوں کے لئے صرف دو راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کرلیں انکی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔" (حرفِ اقبال ص۱۳۷)

یہ مفادات اسی سے وابستہ ہیں کہ مرزائیت اسلام کے لئے دام ہمرنگ زمین بن کر مارِ آستین بنا رہے۔ پھر کیا وہ اپنے الگ تشخص اور کسی انفرادی امتیاز کو قبول کرسکتے ہیں۔ اس کا جواب دینے میں علامہ اقبالؒ نے کتنی حقیقت بینی کا ثبوت دیا کہ :

> "ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئیے، بانی تحریک نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول

رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار اپنی جماعت کا نیا نام مسلمانوں کے قیام نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ تمام دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں زیادہ دور ہیں جتنے سکھ ہندوؤں سے، کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں مگر وہ ہندو کے مندروں میں پوجا نہیں کرتے ص۱۲۷ "

اس علیحدگی اور مقاطعہ و متارکہ کے باوجود مرزائی ہم سے رواداری اور حسن ظن کی امید رکھتے ہیں۔ وہ تو ہمیں کافر سمجھیں مگر ادھر سے اسلام کی تعریف کا مطالبہ بھی تفرقہ انگیزی اور شدپسندی ہو ان دوطرفہ مفادات کی آخر وہ ملت مسلمہ سے کس بنیاد پہ توقع رکھتی ہے۔؟ کیا اس وجہ سے کہ اس نے مسلمانوں کی آبروئے دنیا و دین متاع اولین و آخرین روح کائنات سرور عالمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ردائے ختم نبوت اور خلعت ختم المرسلینی پہ ڈاکہ ڈالا اور ملت مسلمہ کی غیرت ایمانی کو مجروح کیا۔ کیا کسی ملت کے قلعہ وحدت کو پاش پاش کرنے کی جرأت کا اتنی فراخدلی سے صلہ دیا جاسکتا ہے جسکی مرزائیت ہم سے طلبگار ہے اور کیا حصار اسلام میں پے در پے نقب لگانے کے بعد بھی مرزائیت مسلمانوں کی کسی حکومت کی اتنی کرم فرمائیوں کی مستحق ہو سکتی ہے۔ کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر اپنے بعض کرم فرماؤں کی آزردہ دلی کو ملحوظ رکھتے ہوئے آج کی یہ تقریب اقبالؒ ہی کے الفاظ پر ختم کر کے دوسری فرصت پر اٹھانا چاہتے ہیں۔

"میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گذرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے حکومت نے ۱۹۱۹ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے مطالبے کا انتظار نہ کیا اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبے کا کیوں انتظار کر رہی ہے ص۱۳۸"

★

ممتاز قانون دان بروہی صاحب نے پشاور کی ایک تقریب میں علماء کے حق قانون سازی کے بارہ میں جس دل آزار انداز میں علماء پر تبصرہ کیا اسکی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے اگر علماء کو قرآن وحدیث

میں مہارت، کے باوجود قانون سازی کا حق نہیں تو ایک انگریزی دان وکیل کو یہ حق کیسے دیا جاسکتا ہے۔ ؟ شاید بروہی صاحب کو اپنی وہ اجارہ داری خطرہ میں نظر آنے لگی ہے۔ جو ایک غیر اسلامی انگریزی تہذیب اور نظام میں تو انہیں حاصل ہو سکتی ہے مگر خالص اسلامی خطوط پر مبنی معاشرہ میں نہیں ---
بروہی صاحب کی "اسلام پسندی" کا شہرہ ہمیں ویسے بھی کھٹک رہا تھا، بالآخر وہ اصل لباس میں عیاں ہوگئے۔ صوبہ سرحد میں اسلامی قوانین کے احیاء کی کوششیں بہت سے الحاد پسندوں کیساتھ مغربی سامراج اور کفر کی تمام طاقتوں کو کھٹک رہی ہیں۔ پھر کیا درپردہ بروہی صاحب کسی ایسی طاقت کی وکالت اور ترجمانی کرنے تو صوبہ سرحد نہیں آئے تھے۔ ؟ ایسے ریمارک کی بجائے اگر بروہی صاحب یہ کہہ دیتے کہ علماء کرام قانون سازی کو جدید خطوط پر مدون کرتے وقت وکلاء اور جدید تعلیمیافتہ طبقہ کو نظر انداز نہ کریں تو معقولیت کا مظاہرہ ہوتا جس کا جواب بھی مفتی محمود صاحب نے آئینی کمیٹی میں علماء اور قانون دانوں کے باہمی اشتراک کی شکل میں عملاً دیدیا ہے۔

جمعیۃ العلماء اسلام نے سرحد میں نیپ کے تعاون سے مختصر وقت میں جو کچھ کیا اور جو عزائم لیکر اٹھی ہے وہ پورے ملک کیلئے قابلِ تحسین و تقلید ہونے چاہئیں۔ شراب پر پابندی، اردو کو سرکاری زبان قرار دینا، جہیز پر پابندی، سود کی تحدید اور امن وامان کے لئے جدوجہد۔ مختلف طبقات کے درمیان نفرت کی بجائے الفت کی کوششیں یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ پوری قوم اسے سراہے گی اور ان میں سے ہر بات بجائے خود اتنی اہم کہ مدتوں سے اسکی مثال نہیں مل سکتی اگر خدا نے اسے توفیق دی اور مسلمانوں نے اس کے اقدامات کی تائید کی تو کیا عجب کہ سرحد ایک مثالی صوبہ بنکر پورے ملک کی کایا پلٹ دے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

صدر محترم نے مغربی جرمنی کے انٹرویو نگار کو انٹرویو کے دوران اور پھر طویل حالیہ سفر میں بعض تقاریب میں سوشلزم کیساتھ مارکسزم کی اصطلاح بھی استعمال کی اور ایسا "مژدہ" سنایا کہ گویا وہ اسلام کیساتھ اب مارکسزم کی پیوندکاری بھی کرنا چاہتے ہیں یہ خلط ظلمت و نور، حق و باطل، مذہب و الحاد، مادیت اور روحانیت کا اجتماع ہر حالت میں ناقابل فہم ہے۔ مساوات کے بعد سوشلزم اور اب سوشلزم کے بعد مارکسزم۔ انا للہ ......
سقوط مشرقی پاکستان کے بعد کتنے اور تجربات "کرانے" ہیں۔ ؟ ان غیر محتاط اصطلاحات اور دعووں نے ہمیں کہاں پہنچا دیا پھر عبرت کی نگاہوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمیں کھٹکتی کیا ہمارے قلوب بالکل مسخ ہو چکے ہیں۔ ؟ اور اللہ کے قانون احتساب اور اعمال کی شامت کا ہمیں کوئی احساس نہیں رہا۔ ؟ اور ہمیں اس سے بھی بدتر یوم الحساب کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ؟ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔ سمیع الحق

ماہنامہ فلسطین - بیروت - جنوری ۷۲ ۱۹ء
کے ایک اداریہ کا ترجمہ

تخریبِ پاکستان میں یہودی سازش

دنیائے عرب کو جاننا چاہیئے کہ یہودیوں کی تازہ ترین سازش جو دنیا کی قوی ترین مسلم مملکت پاکستان کے اتحاد، اس کی شان و شوکت و قوت کی شکستگی کے لئے کی گئی، مختلف عناصر، وجوہات اور اہداف پر مشتمل تھی اور اس میں عالمی صیہونیت کی تدابیر نے اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ یہ محض اس لئے ہوا کہ پاکستان نے فلسطینی مسائل میں ہمیشہ دلچسپی لی اور مختلف اوقات اور مواقع پر قابلِ قدر حصہ لیتا رہا ہے۔ نیز یہودیت و صیہونیت کی توسیع پسند تحریکوں کے مقابل اخوتِ اسلامی کے تحت عرب ممالک کی ہمیشہ امداد کی ہے۔

یہ بات ہم یونہی نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ ہمارے ان خیالات و نظریات کی یہودی تحریریں اور تقریریں خود دلالت کرتی ہیں۔ یہاں ہم صیہونی لیڈروں اور پریس کی تحریروں اور تقریروں کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جو پاکستان پر بھارت کے تازہ ترین حملہ کے سلسلہ میں یہودی سازش پر روشنی ڈالتے ہیں، تاکہ اس بھارتی حملہ کے متعلق دنیائے عرب کے خیالات پوری طرح صاف ہو جائیں۔ اور وہ ہندو اور یہود کے فریب اور جھوٹے پروپیگنڈہ کو پرکھ سکیں۔

پاکستان کے خلاف یہودی سازش آج کی پیداوار بھی نہیں بلکہ یہ ایک پرانی تحریک ہے جس کا اظہار آج سے بہت پہلے جزائر برطانیہ میں صیہونی (یہودی) تنظیموں کی آواز ہفتہ وار "جیوئش کرونیکل" کی ۹ر اگست ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں ہو چکا ہے۔ اس ہفت روزہ میں اسرائیل کے سابق وزیرِ اعظم بن غوریون کی سوربون یونیورسٹی (پیرس) میں کی گئی تقریر کے مندرجہ ذیل اقتباسات چھپے تھے۔
۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد تقریر کرتے ہوئے بن غوریون نے کہا تھا ......

"عالمی صیہونی تحریک کو چاہیئے کہ اپنے خلاف پاکستانی خطروں سے غافل نہ ہو بلکہ اب پاکستان اس کا سب سے پہلے نشانہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ عقائدِ اسلام پر مبنی

یہ حکومت ہمارے وجود کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ تمام پاکستانی باشندے یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے محبت و ہمدردی رکھتے ہیں عربوں کے لئے پاکستان کی یہ محبت و ہمدردی اسرائیل کے حق میں خود عربوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے عالمی صیہونیت کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف فوری اقدام کرے۔

بن غوریون نے اس کا حل بتاتے ہوئے مزید کہا کہ:

"چونکہ ہندوستان کے رہنے والے ہندوؤں کے قلوب مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں کے خلاف نفرت سے بھرے ہوتے ہیں اس لئے ہمارے لئے پاکستان کے خلاف کام کرنے کا بہترین اڈا (BASE) ہندوستان ہے۔ پس ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم اس اڈے سے پورا فائدہ اٹھائیں اور پاکستانیوں کو جو یہودیوں اور صیہونیت کے دشمن ہیں تمام خفیہ اور چھپی تدابیر کے ذریعہ پیس کر رکھ دیں۔"

پروفیسر ہرٹز (HERTZ) (امریکی یہودی) جو فوجی امور کا ماہر بھی ہے اپنی کتاب تطرفنا العسکریۃ فی الشرق الاوسط کے صـ۲۱۵ پہ پاکستانیوں کے خلاف زہر اگلتے ہوئے رقمطراز ہے:

"پاکستانی فوج کے قلوب رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں اور یہی وہ جذبہ ہے جو پاکستان اور عربوں کے درمیان تعلقوں کو مضبوط کرتا ہے۔ یہ جذبہ عالمی صیہونیت (یہودیت) کے لئے ایک خطرۂ عظیم اور اسرائیل کی توسیع کے راستہ میں ایک زبردست رکاوٹ ہے اس لئے یہودیوں کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ محمد کے ساتھ اس جذبۂ محبت کے تمام وسیلوں کو کمزور ترین کریں اور تبھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

یہی نہیں بلکہ مشرقی پاکستان میں اقتدار کی کشمکش شروع ہوتے ہی اور بنگلہ دیش کا نعرہ بلند ہوتے ہی اسرائیلی حکومت نے عوامی لیگی لیڈروں کی جدوجہد آزادی کو نہ صرف سراہا تھا بلکہ اسرائیلی وزیر خارجہ ابا ایبان نے بروقت ضرورت ہتھیار بھی فراہم کرنے کی پیشکش کی تھی۔ (ماہنامہ فلسطین بیروت جنوری ۱۹۷۲ء)

ابھی پروٹوکول کے کاغذات بوسیدہ بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور ابھی بن غوریون اور پروفیسر ہرٹز کا پیمانۂ حیات لبریز بھی نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کے حکمرانوں کی غفلت، عیاشی اور بدکرداری کے باعث یہودی اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے اور وہ ملک جس کے حصول میں لاکھوں بندگانِ خدا کا خون بہا تھا

باقی صـ۵۲ پر

بحث و نظر

جنابہ محترم تنزیل الرحمان صاحب

ایڈوکیٹ ۔ کراچی

شراب نوشی کی سزا

آج تنزیلے مطمئن ہو رہا ہوں تعریب یہ ہے کہ
مفتی محمود صاحب نے سرحد میں شراب پر پابندی
لگادی ہے۔ یہ بات اس مضمون کی متقاضی
ہوگی۔

تنزیل الرحمان

قرآن پاک، احادیث نبوی، آثار اور اقوال فقہا میں شراب کے لئے "خمر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے معنی انگوری شراب کے ہیں۔

شراب کی حرمت قرآن پاک کی آیت: انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ (۱) کے ذریعہ خمر قطعی طور پر نصاً حرام ہے۔ خواہ تھوڑی پی جائے یا بہت، خواہ نشہ ہو یا نہ ہو، خواہ پینے والا نشہ میں بہکے یا نہ بہکے۔ اس سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ خمر کی حرمت قطعی النص ہے۔ البتہ خمر کے علاوہ دیگر نشہ آور اشیاء (مسکرات) مثلاً بھنگ، افیون، چرس، گانجا وغیرہ میں نشہ شرط ہوگا۔ چنانچہ خمر میں حد ہے جب کہ ان دیگر مسکرات میں بطور سزا حد نہیں ہے۔ تعزیر ہے کیونکہ ان دیگر مسکرات کی حرمت ظنی ہے۔ جس کی علت نشہ ہے۔ جب کہ خمر کی حرمت قطعی ہے جس کی دلیل خود قرآن پاک کی مذکورہ بالا آیت ہے۔ یہ مسلک امام ابو حنیفہ کا ہے۔ (۲)

صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمد) کے نزدیک مسکرات کا بھی وہی حکم ہوگا جو خمر کا ہے۔ یعنی سب میں حد جاری کی جائے گی۔ (۳) ائمہ ثلاثہ (امام مالک[۴]، امام شافعی[۵]، امام احمد بن حنبل[۶]) بھی صاحبین سے متفق ہیں۔ امام ابن حزم ظاہری۔ (۷) کے نزدیک بھی ہر نشہ خمر ہے، اور اس پر حد جاری کی جائے گی۔ گویا ظاہریہ صاحبین سے متفق ہیں۔ شیعہ امامیہ کے نزدیک بھی یہی صورت ہے۔ (۸)

شراب نوشی کی حد شراب نوشی کی حد کے سلسلے میں قرآن پاک میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی۔

البتہ سنت نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ و تابعین میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ان احادیث و آثار کو کتب احادیث صحیح البخاری، صحیح المسلم، سنن، ابو داؤد، جامع الترمذی، سنن ابن ماجہ، موطاء امام مالک، موطاء امام محمد، سنن دار قطنی، السنن الکبرٰی، بیہقی اور کنز العمال میں بالتفصیل دیکھا جا سکتا ہے۔

حضور صلعم کی سنت | مذکورہ بالا کتب احادیث کی کتاب "الحدود" کے باب حد الخمر کے تحت بیان کردہ روایات کے مجموعی مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شراب نوشی کے جرم میں عقوبت (سزا) تو ثابت ہے مگر محض کسی ایک سزا کا بطور حد لازم و متعین ہونا ثابت نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث میں فاضربوہ کے الفاظ میں محض یہ حکم ہے کہ لوگو! اس (شرابی) کو مارو۔ چنانچہ اکثر احادیث، بالخصوص صحیح البخاری (۹) میں ہاتھوں، جوتوں، پیڑ کی ٹہنیوں اور کپڑے کی بٹیوں سے مارنے کا ذکر ہے۔ جب کہ بعض چند دیگر احادیث، مسلم (۱۰)، ابو داؤد (۱۱)، کنز العمال (۱۲) میں "جلد" کوڑے مارنے کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح اکثر احادیث میں محض مارنے کا ذکر آیا ہے۔ تعداد بیان نہیں ہوئی۔ جب کہ بعض احادیث میں چالیس اور بعض میں اسّی کی تعداد مذکور ہے۔ بالفاظ دیگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت حد خمر کے سلسلے میں مختلف رہی ہے۔ آپ سے حد کی قطعی تعین ثابت نہیں۔

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا عمل | حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے "بلا اختلاف" چالیس کوڑے مارنا منقول ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے چالیس، ساٹھ اور آخر زمانۂ خلافت میں اسّی دُرّے مارنا بطور حد تام (مکمل) بلا اختلاف ثابت ہے۔

در اصل حضورؐ کی سنت جوتوں اور ٹہنیوں سے مارنا بھی تھی اور کوڑے مارنا بھی ضربات کی تعداد ۴۰ بھی تھی اور اسّی بھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے حد خمر میں کوڑے اور ۴۰ کی تعداد کو اختیار کیا اور جاری فرمایا جس پر کچھ عرصہ تک حضرت عمر بھی عامل رہے مگر بعد میں جب آپ نے دیکھا کہ لوگ ۴۰ دروں کی سزا کو خاطر میں نہیں لاتے اور شراب نوشی کی طرف زیادہ مائل ہو رہے ہیں تو آپ نے صحابہ کرام کے مشورے سے ۸۰ دروں کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس کو ایک مستقل تشریعی حکم حیثیت دے دی۔

ائمہ اربعہ، ظاہریہ اور شیعہ امامیہ کا مسلک | حنفیہ کے نزدیک بالاتفاق حد خمر ۸۰ دُرّے ہے۔ (۱۳) امام مالک بھی ۸۰ درے حد کے قائل ہیں۔ (۱۴) امام شافعیؒ کے نزدیک ۴۰ درے حد ہے اور چالیس تعزیر۔ (۱۵) امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی حد خمر اسّی درے ہے (۱۶)
ابن حزم ظاہری کے نزدیک بھی چالیس درے ہے (۱۷)

البتہ شیعہ امامیہ حد کے مسئلہ میں حنفیہ سے متفق ہیں۔ اور ۸۰ درے حد خمر کے قائل ہیں۔ (۱۸)

موجودہ حالات میں مسئلہ کا حل | برصغیر پاک وہند میں بدقسمتی سے تقریباً گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزوں کا بنایا ہوا قانون راج کر رہا ہے۔ جس میں شراب نوشی سرے سے جرم ہی نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص شراب پی کر شارع عام پہ دنگا فساد مچائے تو قانون اسے امن عامہ کا مسئلہ قرار دیکر دست اندازی کرتا ہے۔ لوگ اس کے بے حد عادی ہو چکے ہیں۔ عوام کو چھوڑ کر خواص میں یہ مرض زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور اب تو شراب پینا ترقی پسندی کی ایک علامت بن گیا ہے۔ اس لئے میری رائے میں فی الفور حد تام (۸۰) کا نفاذ مناسب نہ ہوگا ہمارے لئے اس مسئلہ کے حل کرنے کا منہاج (METHODOLOGY) اسلام کے ابتدائی دور کا سا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ:

۱۔ شراب نوشی کے جرم کے پہلی بار مرتکب کو جوتوں یا قمچی (بینت) سے ۴۰ یا ۸۰ ضربیں (جو تعداد آپ مناسب خیال فرمائیں) لگائی جائیں۔

۲۔ دوسری بار مرتکب جرم کو چالیس کوڑوں کی سزا دی جائے۔ اور

۳۔ تیسری بار مرتکب جرم کو اسی کوڑوں کی سزا دی جائے۔

واضح رہے کہ تینوں سزائیں سنت سے ثابت ہیں۔

شراب کی حد کے سلسلے میں چند ضروری اصول اور ضابطے | یہ ضربیں یا حد (جیسی صورت ہو) جسم کے متفرق مقامات پر لگائے جائیں۔ ایک ہی جگہ نہ مارے جائیں۔ مارنے میں یہ احتیاط لازم ہے کہ سر، چہرے اور شرم گاہ پر نہ مارے جائیں۔ (۱۹)

اگر مجرم مرد ہو تو اسے کھڑا کر کے اور عورت ہو تو بٹھا کر سزا دی جائے۔ مرد ہو تو اس کے بدن پر سے کپڑے اتار لئے جائیں، سوائے پاجامہ کے تاکہ ستر ڈھکا رہے۔ عورت کے کپڑے نہ اتارے جائیں اس کا پورا جسم ستر ہے۔ (۲۰) نیز یہ کہ حد نشہ اتر جانے کے بعد ماری جائے۔ (۲۱)

حد مسجد میں نہ ماری جائے۔ (۲۲) مقام عام ہو تو بہتر ہے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔

بھنگ، افیون اور چرس میں حد نہیں بلکہ تعزیر ہے (۲۳) جو دس کوڑوں تک ہو سکتی ہے۔ (۲۴) کیونکہ یہ النسانی اعضاء کو بے حس اور حواس میں فتور ڈالنے والی ہیں۔ (۲۵)

اگر نشہ مباح چیز سے ہو تو حد یا تعزیر واجب نہیں۔ اسی طرح اگر کسی دوا یا معجون میں افیون کا جزو شامل ہو مگر مغلوب ہو تو مضائقہ نہیں۔ (۲۶)

شراب نوشی کی حد صرف عاقل بالغ اور ناطق مسلم کو دی جا سکتی ہے۔ گونگے پر حد نہیں ہے۔ غیر مسلم پر بھی حد قائم نہیں ہوتی۔ (۲۷) شراب نوشی کی حد جاری کرنے کے سلسلے میں شہادت کا نصاب دو مردوں کی گواہی ہے۔ شراب کی حد میں عورتوں کی شہادت مقبول نہیں (۲۸) حد جاری کرنے کے سلسلے میں ضروری ہے کہ شراب اپنی خوشی سے بلا جبر واکراہ وبلا اضطرار پی گئی ہو۔ (۲۹)

قاضی کو چاہیئے کہ گواہوں سے پینے کی کیفیت دریافت کرے تاکہ اکراہ کا احتمال نہ رہے۔ پینے والی چیز کے بارے میں خوب استفسار کرے محض بو کا وجود کافی نہیں۔ اگر گواہوں کے بیان آپس میں مختلف ہوں مثلاً ایک شراب پینے کی گواہی دے اور دوسرا مسکر (غیر شراب) کی گواہی دے تو حد نہ ماری جائے گی۔ بلکہ ایسی صورت میں تعزیر ہے۔ (۳۰)

قاضی کو چاہیئے کہ حد قائم کرنے سے پہلے گواہوں کے بارے میں چھان بین کر کے اطمینان کرلے کہ عادل ہیں۔ (۳۱)

بذریعہ ریڈیو و اخبارات اور عام منادی کرادی جائے کہ شراب نوشی قانوناً ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ اب جو شخص شراب پیئے گا اس کو حسب قانون سزا دی جائے گی۔

حد خمر مارنے کے سلسلے میں کتب حدیث میں اس امر کی صراحت پائی جاتی ہے کہ کوڑا دوسری حدیں مارنے کے مقابلے میں ہلکا ہو اور اس کے آخر میں گرہ نہ ہو۔ (۳۲)

چنانچہ اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ وہ شخص حد جاری کرنے کے سبب مر نہ جائے۔ اگر حد خمر جاری کرنے کے سلسلے میں مر گیا تو حکومت کو اسکی جان کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ (۳۳)

حد خمر نافذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملزم بعجلت (باستثنار بعد مسافت) قاضی شرع کے روبرو پیش کیا جائے۔ اگر گواہوں نے شراب کی بو ختم ہو جانے کے بعد گواہی دی تو جرم ثابت ہو جانے پر قاضی حد کے بجائے تعزیر دے گا۔

حوالہ جات

۱- سورۂ مائدہ، آیت : ۹۰

۲- الدر المختار (برحاشیہ رد المحتار) علاؤ الدین حصکفی، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۷ھ، جلد ۳، ص ۲۲۷۔ (فقہ حنفی)

۳- ایضاً

۴- موطا امام مالک، مع شرح زرقانی، مطبوعہ مصر، ۱۲۸۱ھ، جلد ۵، ص ۱۲۴ (فقہ مالکی)

۵۔ مغنی المحتاج، الشربینی الخطیب، مطبوعہ مصر، ۱۹۵۸ء، جلد ۴ ص ۱۸۹ (فقہ شافعی)
۶۔ الاقناع۔ شرف الدین المقدسی۔ مطبوعہ مصر، جلد ۴، ص ۲۶۷ (فقہ حنبلی)
۷۔ المحلی، امام ابن حزم الظاہری، مطبوعہ مصر، جلد ۸، ص ۴۴۸ (فقہ ظاہری)
۸۔ شرائع الاسلام، امام ابوجعفر نجم الدین المحلی، مطبوعہ بیروت، جلد ۲ القسم الرابع، ص ۲۵۲ (فقہ شیعی)
۹۔ الصحیح البخاری، کتاب الحدود، باب ماجاء فی ضرب الخمر: عن انس ان النبی ضرب فی الخمر بالجرید والنعال وجلد ابوبکر اربعین۔ (یہ حدیث ابن ماجہ نے بھی بیان کی ہے۔) عن ابی ھریرۃ اتی النبی برجل قد شرب قال اضربوہ، قال ابوھریرۃ فمنا الضارب بیدہ والضارب بنعلہ والضارب بثوبہ۔ (یہ حدیث ابوداؤد اور ابن حزم نے بھی بیان کی ہے۔)

عن السائب بن یزید قال کنا نؤتی بالشارب علی عھد رسول اللہ وامرۃ ابوبکر وصدرا من خلافۃ عمر فنقوم الیہ بایدینا ونعالنا وارديتنا حتی کان آخر امرۃ عمر فجلد اربعین حتی اذا عتوا وفسقوا جلد ثمانین۔
یہ حدیث ابن حزم نے بھی نقل کی ہے۔
۱۰۔ الصحیح المسلم، کتاب الحدود، باب فی حد الخمر: عن انس بن مالک ان النبیؐ برجل قد شرب الخمر فجلدہ بجریدتین نحو اربعین وقال وفعلہ ابوبکر فلما کان عمر استشار الناس فقال عبدالرحمٰن بن عوف اخف الحدود ثمانین فامر بہ عمر
یہ حدیث ترمذی نے بھی نقل کی ہے اور اس کو حسن صحیح کہا ہے۔
۱۱۔ سنن ابوداؤد، کتاب الحدود، باب ماجاء فی حد الخمر: عن علیؓ قال، جلد رسول اللہ وابوبکر اربعین وکملھا عمر ثمانین وکل سنۃ۔
۱۲۔ کنز العمال، علی المتقی، مطبوعہ حیدرآباد (دکن)، ۱۳۷۴ھ، جلد ۵، صفحات ۲۷۳، ۲۸۲
عن علیؓ ان رسول اللہ جلد فی الخمر ثمانین۔
عن الحسن ان النبی ضرب فی الخمر ثمانین۔ مزید دیکھئے حدیث ۱۹۴۸، ۱۹۵۰ جلد ہذا۔
۱۳۔ ہدایہ اولین، مطبوعہ قرآن محل کراچی۔ ص ۵۲۸ (فقہ حنفی)
رد المحتار، ابن عابدین، مطبوعہ مصر، ۱۳۲۷ھ، جلد ۳، ص ۲۲۷ (فقہ حنفی)

۱۴- جواہر الاکلیل شرح مختصر خلیل الآبی، مطبوعہ مصر ۱۹۴۷ء جلد ۲، ص ۲۹۶ (فقہ مالکی)
۱۵- التشریع الجنائی الاسلامی، عبدالقادر عودہ، مطبوعہ مصر، ۱۳۸۳ھ جلد ۱ ص ۵۹، ۶۴۸، ۶۴۹-
۱۶- الاقناع، محولہ بالا-
۱۷- المحلی، محولہ بالا، جلد ۸، ص ۳۶۶-
۱۸- شرائع الاسلام، محولہ بالا-
۱۹- الرد المختار، محولہ بالا، کتاب الحدود- } ماخوذ و مستفاد
تا الہدایہ، برہان الدین مرغینانی، مطبوعہ کراچی، کتاب الحدود
۲۳- الفتاوی العالمگیریہ، مطبوعہ دیوبند، کتاب الحدود
۲۴- المحلی، محولہ بالا، جلد ۸، ص ۲۷۳
۲۵- الرد المختار، محولہ بالا، کتاب الحدود } ماخوذ و مستفاد
تا الہدایہ، محولہ بالا، کتاب الحدود
۳۲- الفتاوی العالمگیریہ، محولہ بالا، کتاب الحدود
۳۳- کنز العمال، محولہ بالا، جلد ۵، ص ۲۲۱
۳۴- الرد المختار، محولہ بالا، کتاب الحدود

ایڈیٹر ہفت روزہ الاعتصام - لاہور

ایڈیٹر ماہنامہ البلاغ کراچی

مسلمان کی تعریف اور مرزائی و پرویزی حضرات

قومی اسمبلی میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نے مسلمان کی تعریف کے بارہ میں حزبِ اقتدار کے چیلنج کا جواب پورے حزبِ اختلاف کی متفقہ تائید سے دیدیا تھا۔ اس وقت اسمبلی میں موجود مختلف مکاتبِ فکر کے علماء نے اس سے اتفاق ظاہر فرمایا۔ بریلوی مکتبِ فکر کے اکابر مولانا شاہ احمد نورانی صاحب مولانا ازہری صاحب نے اسمبلی سے باہر بھی اس کا ذکر کر کے اتفاق ظاہر کیا۔ اب اہلِ سنت کے ایک دوسرے ممتاز اور اہم مکتبِ فکر اہلِ حدیث کے ترجمان اخبار ہفت روزہ الاعتصام کے فاضل مدیر نے پیش نظر اداریہ میں مولانا کے پیش کردہ تعریف کو جامع اور معقول قرار دیکر آئین میں مسلمان کی تعریف کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اور اس طرح مسلمان کی تعریف کے بارہ میں اہلِ سنت کے ہر سہ مکاتبِ فکر دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث کی متفقہ رائے سامنے آنے سے آئینی کمیٹی کی آزمائش میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اور اس پروپیگنڈہ کا بھانڈہ پھوٹ گیا ہے کہ علماء اس بارہ میں متفق نہیں ہو سکتے۔ (ادارہ)

وزیرِ اطلاعات جناب کوثر نیازی صاحب نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں علماء کے اس مطالبے پر کہ آئین میں مسلمان کی تعریف بھی متعین کردینی چاہیئے، جو گوہر افشانی فرمائی تھی اس پر ہم ایک گزشتہ شمارے میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ اور خود اسمبلی میں بھی وہاں موجود بعض علماء نے ان کے "فرمودہ" کا معقول

جواب دے دیا تھا اور "مسلمان" کی ایک ایسی تعریف بھی کر کے بتلا دی تھی جس پر سب علماء کا اتفاق ممکن ہے۔ مثلاً جمعیت علمائے اسلام کے مولانا عبدالحق آف اکوڑہ خٹک و ممبر قومی اسمبلی نے اسمبلی میں فرمایا تھا کہ

"مسلمان وہ ہے جو کتاب وسنت اور ضروریات دین کو ان تشریحات کے ساتھ قبول کرتا ہو جو حضورؐ سے بلکہ خیر القرون میں اور پھر اب تک سمجھے جا رہے ہیں۔ مثلاً نماز اور زکوٰۃ کو من مانے مفہوم پہنانے والے کو مسلم نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ حضورؐ کو آخری نبی سمجھے بایں معنیٰ کہ حضورؐ کے بعد کسی شخص کو نہ ظلی نہ بروزی نہ مستقل یعنی کسی قسم کی نبوت نہیں مل سکتی اور ایسا دعویٰ کرنے والا کافر ہے۔"

یہ "تعریف" کافی حد تک جامع اور معقول ہے، ظاہر ہے جب آپ کسی چیز کے ماننے کا اقرار کریں گے تو اس کا مطلب اس شئی کی من مانی تعبیر کے ساتھ ماننا نہیں ہوگا، بلکہ اسی مفہوم اور تشریحات کے ساتھ ماننے کا ہوگا جو اس کے اصل واضعین کے پیش نظر ہوں گی۔ من مانی تعبیرات کے ساتھ کسی چیز کو ماننے کا نام سرے سے اقرار و اعتراف ہے ہی نہیں، دنیا اسے اس چیز کا منکر ہی کہے گی، لیکن اس تعریف سے دو نہایت ہی حقیر اقلیتیں سیخ پا ہوتی ہیں۔ ایک مرزائی دوسرے حدیث رسولؐ کو حجت اور ماخذ ثانی ماننے سے انکار کرنے والے چکڑالوی و پرویزی وغیرہ۔ کیونکہ اس طرح ان کی ڈاڑھی کا تنکا نظر آجاتا ہے۔ اور وہ مسلمانوں کے مسلمہ عقائد و روایات سے انحراف کی وجہ سے اُمتِ مسلمہ سے الگ تھلگ ہو کر رہ جاتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ اپنے عقائد کی اصلاح کریں۔ اور مسلماتِ امت کو تسلیم کریں، وہ مسلمان کی تعریف کو اس طرح موم کی ناک بنا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اسلام سے ہر طرح کی بغاوت کے بعد بھی بزعم خویش "مسلمان" بن کر رہیں، گویا ؎ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

چنانچہ ان دو طبقوں نے اپنے ذہنی تحفظات کے پیش نظر وزیر اطلاعات کے اس بیان پر داد و تحسین کے خوب ڈونگرے برسائے ہیں جو انہوں نے مسئلہ زیر بحث میں قومی اسمبلی میں دیا تھا، جس میں باہمی اختلاف کی آڑ لے کر "مسلمان" کی تعریف کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور اسے "دلائل و براہین" کا اچھوتا نمونہ اور "حق گوئی" کا بے مثال مظاہرہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ وزیر موصوف کا وہ بیان عقل و فکر کی میزان اور نقد و نظر کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا، وہ بالکل ایک سطحی بیان ہے جس میں کوئی معقولیت نہیں، جیسا کہ ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ لیکن چونکہ ان دونوں طبقوں کے مفادات و تحفظات اسی "علم کلام" کے رہین منت ہیں اس لئے وہ اس پر بغلیں بجا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب مرزائیوں پر ہے جو انتہائی دیدہ دلیری

اور پوری بے شرمی و ڈھٹائی سے "سب کلمہ گو مسلمان ہیں" کا راگ الاپ رہے ہیں۔ حالانکہ اگر واقعہ یہ ہوتا کہ عقائد سے قطع نظر محض کلمہ پر ہی اسلام کا انحصار ہوتا تو آنجہانی مرزا تمام کلمہ گو مسلمانوں کو کافر کیوں قرار دیتا۔؟ خود لاہوری مرزائی ربوی مرزائیوں کے کفر کے کیوں معتقد ہیں۔؟ یہ سوال ہم متعدد مرتبہ ان کالموں میں مرزائیوں سے کر چکے ہیں، لیکن اس کا وہ کوئی معقول جواب نہیں دیتے۔ بہرحال اس سلسلے میں نہ وزیر صاحب موصوف کا بیان حقیقت پسندانہ ہے۔ اور نہ اس پر خوشی کے شادیانے بجانے والے مرزائی و پرویزی حضرات کے طرز عمل میں کوئی معقولیت ہے۔ (الاعتصام - لاہور)

البلاغ | یہ مسئلہ خود اسمبلی میں زیر بحث آیا تھا اور اسمبلی کے ارکان علماء نے مسلمان کی تعریف شامل دستور کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن حکومت کے حلقوں کی طرف سے رسوائے زمانہ منیر انکوائری رپورٹ کا حوالہ دے کر یہ کہا گیا کہ مسلمان کی تعریف پر علماء میں اتفاق موجود نہیں ہے۔ اور اگر وہ متفقہ طور پر مسلمان کی کوئی تعریف پیش کر دیں۔ تو اسے دستور میں شامل کر لیا جائے گا۔ یہاں ہم اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ منیر انکوائری رپورٹ میں کیسی شرمناک جانبداری سے کام لیا گیا تھا۔ اور خاص طور سے مسلمان کی تعریف کے سلسلے میں علماء کے بیانات کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ ہم اس بات کو بھی یہاں نظر انداز کرتے ہیں کہ مسلمان کی تعریف کے سلسلے میں علماء کے کسی اختلاف کا نعرہ کس قدر بے بنیاد ہے۔ لیکن جمعیت علماء پاکستان کے رہنما مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری نے جو قومی اسمبلی کے رکن ہیں، کراچی کی ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا ہے۔ کہ حکومت کی طرف سے اس مطالبے کے بعد قومی اسمبلی کے اراکین علماء نے مسلمان کی مندرجہ ذیل تعریف کی ——— ——— (آگے شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب کی پیش کردہ تعریف نقل کر کے) لیکن جب علماء نے اسمبلی میں یہ تعریف پیش کی تو حکومت کے حلقے اپنے دعوے سے منحرف ہو گئے۔

بہرکیف! جب صدر کے لئے مسلمان ہونے کی شرط متفقہ طور پر مسلم ہے۔ تو ظاہر ہے کہ "مسلمان" کا کوئی لگا بندھا مفہوم بھی دستور میں درج ہونا چاہیے۔ تاکہ کوئی غیر مسلم محض مسلمانوں کا سا نام رکھ کر ملک و ملت سے غداری کا مرتکب نہ ہو سکے۔ (ماہنامہ البلاغ کراچی۔ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ)

۵۲

سلسلہ ۴ و ۵

میری علمی و مطالعاتی زندگی

۱۔ حضرت علامہ مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی
سابق شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ حال مدرسہ عربیہ
نیو ٹاؤن کراچی

★

۲۔ جناب ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی ڈائریکٹر
ادارۂ تحقیقات اسلامیہ اسلام آباد

مکرم و محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ موصول ہوا۔ میں اب تک "الحق" کیلئے کچھ نہیں لکھ سکا۔ گرامی نامہ کے جواب میں تاخیر کے ساتھ دے رہا ہوں۔ دونو قصوروں کیلئے معذرت خواہ ہوں اور شرمندہ۔ ان دونو کا سبب ایک ہی ہے۔ یعنی کثرت مشاغل۔ پہلے قصور کی تلافی کرنے کی کوشش انشاء اللہ عنقریب کروں گا۔

سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

الف: اس سوال کا جواب میرے لئے آسان نہیں ہے۔ تفصیل آپ کیلئے باعث زحمت ہوگی اور اجمال میرے لئے تنگی کا سبب، تاہم تابہ امکان دونو چیزوں سے بچتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

محترما! علم کے دو معنی ہیں۔ ۱۔ معلومات ۲۔ تنویر عقل۔ جملہ علوم سے خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی عقل انسانی کو ایک روشنی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس روشنی کا رخ درست ہونا لازم ہے۔ اگر یہ صحیح زاویئے سے نہ ڈالی جائے گی تو غلطی ناگزیر ہے۔ مثلاً کسی ایسی زمین پر جس میں متعدد گڑھے ہیں شب کو تا سطح زمین کے متوازی ڈالیں تو گڑھے آپ کی نظر سے مخفی ہوجائیں گے اور جو شخص اس روشنی سے اعتماد کرکے اس زمین پر چلے گا، وہ کسی نہ کسی گڑھے میں گریگا۔ بخلاف اس کے اگر آپ ذرا بلندی پر کھڑے ہوکر اسی زمین پر عمودی شکل میں روشنی ڈالیں تو گڑھوں کا اندرونی حصہ بھی روشن ہوجائے گا، اور رہرو کے لئے گرنے کا خطرہ نہ رہے گا۔ احقر کے خیال میں انسان کی علمی زندگی کا اہم ترین اور جوہری حصہ یہی ہوتا ہے یعنی نور عقل کے انتشار کا رخ اور زاویہ۔

اس تمہید کے بعد عرض کرتا ہوں کہ میری علمی زندگی

کے اس جزوِ اعظم پر جن چیزوں نے سب سے زیادہ اثر کیا ہے۔ وہ دو کتابیں ہیں۔ اوّل کتاب اللہ اور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور احادیث کے مجموعوں میں سب سے زیادہ تاثیر بخاری شریف میں محسوس ہوئی۔

ان کے بعد جن کتابوں سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ سیدی و مرشدی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی تصنیفات و تالیفات ہیں۔ انکی شخصیت کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عیاں را چہ بیان۔ اور متعارف کا تعارف کرانے کی کیا حاجت ہے۔ حضرت مولانا عبدالشکورؒ کی ذات بھی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ انکی شخصیت اور انکی تصنیفات کا بھی میرے ذہن پر ایک خاص اثر ہوا۔ اور اسے ایک خاص رخ ملا۔ مکتوباتِ امام ربانیؒ اغاثۃ اللھفان، احیاء العلوم بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہیں۔ ہاں! گلستان بوستان حضرت سعدیؒ کا تذکرہ ہی کرنا بھول گیا۔ بچپن میں دونو کتابیں پڑھی تھیں۔ لیکن ان کا لطف اب تک محسوس کرتا ہوں۔ امام شاطبیؒ اور انکی تصنیفات دونو مجھے بہت پسند ہیں۔ الموافقات تو تفقہ پیدا کرنے میں بے نظیر نہیں تو قلیل النظیر ضرور ہے۔ ہدایہ میں بھی "فقیہ گری" کا وصف میں نے پایا، اور اس معاملہ میں اسکی نظیر میری نظر سے نہیں گزری۔ تفسیر میں امام رازیؒ کی تفسیر کبیر مجھے بہت پسند ہے۔ ان کے ذہن کی روانی اور انکی قوتِ اختراع و ایجاد سے جو مباحث مشرقیہ میں بھی بہت نمایاں ہے میں بہت متاثر ہوں۔ امام شعرانی کی سلامت فہم اور مزاجِ شریعت سے واقفیت اور اس کے ساتھ شریعت کے علوم متعلق ظاہر و باطن میں جامعیت نے میرے دل میں ان کی وقعت و عظمت کے ساتھ محبت بھی پیدا کر دی ہے۔ قصہ تو بہت طویل ہے کہاں تک سمع خراشی کروں اتنے ہی پر اکتفاء کرتا ہوں۔

۲۔ میرے اساتذہ کی تعداد زیادہ ہے اس لئے کسی استاد کا مخصوص اثر میرے اوپر نہیں ہوا البتہ ان حضرات میں سے دو استادوں کو میں اب سب اساتذہ سے ممتاز پاتا ہوں اور انکی عظمت قلب میں زیادہ محسوس ہوتی ہے ایک تو حضرت مولانا مفتی حافظ قاری ظہور احمد صاحبؒ حدیث میں نے انہیں سے پڑھی ہے۔ حدیث اور فقہ دونو میں ایسے وسیع النظر عالم دنیائے اسلام میں گنے چنے ہی ہوں گے۔ اس کے ساتھ علوم متداولہ میں بھی اعلیٰ استعداد حاصل تھی۔ اگرچہ حدیث و فقہ کی ایسی بات کسی دوسرے سے سننے میں نہیں آتی۔ موصوف مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں مدت دراز تک صدر مدرس اور مفتی کے منصب پر فائز تھے۔ اسی زمانہ میں مجھے ان سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ ان کے تبحر علمی کے علاوہ بھی میں انکی دو صفتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اوّل انکی طالبعلمانہ زندگی

اور علم سے ان کا شغف جب میں نے ان سے پڑھا ہے تو ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال تھی مگر مطالعہ اور کتب بینی کا شوق ہنوز پورے شباب پر تھا۔ شب کو شاید ہی کسی دن وہ ایک ڈیڑھ بجے رات سے پہلے بستر پر جاتے ہوں۔ مدرسہ میں جو اوقات درس سے خالی ہوتے تھے ان میں بھی فتویٰ نویسی یا مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔

دوسری چیز ان کی سادگی اور متقیانہ زندگی سے طرز تعلیم بھی بہت ہی مفید اور رواج عام کو دیکھتے ہوئے انوکھا تھا۔ خصوصیت یہ تھی کہ کتابیں درجہ میں موجود رہتی تھیں اور دوران تقریر طلبہ کو ماخذ دکھاتے جاتے تھے۔ برسوں کے مطالعہ کے بعد بھی جن ماخذ تک ذہن کی رسائی نہ ہوتی انکا تعارف وہ درس کے وقت ہی کرا دیتے تھے۔

دوسرے استاذ مولانا محب نور صاحبؒ ہیں (بانی مدرسہ معراج العلوم بنوں) مدرسہ قاسم العلوم شاہی مسجد مراد آباد میں ان کے تلامذہ کی صف میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ موصوف وسیع النظر تو نہ تھے، مگر علوم میں پختگی اور انکا استحضار غیر معمولی تھا۔ یہ دو صفتیں ایسی تھیں جو انہیں ممتاز علماء کی صف میں جگہ دیتی تھیں۔ زندگی سادی، طالبعلمانہ اور متقیانہ تھی۔ مطالعہ کا تو اتنا شوق نہ تھا مگر پڑھانے کا شوق بے حد تھا۔ صبح سے عشاء تک بلکہ اسکے بعد بھی دیر تک یہی مشغلہ سب سے بڑا اور دلچسپ مشغلہ تھا۔ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے، قوی اور تندرست تھے۔ اس لئے تھکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ برد اللہ مضجعہ وطاب ثراہ

د ـــــ ہند میں بکثرت رسائل میرے پاس آتے تھے جن کے دیکھنے کا موقع بھی کم ہی ملتا تھا۔ یہاں دو رسالوں کو جانتا ہوں۔ بینات اور الحق دونوں ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں۔

ہ ـــــ "د" میں اسکا جواب بھی آگیا۔

ز، ح، ط ـــــ یہ خط ان سوالات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے مستقل مضمون کی حاجت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لٹریچر کی کمی ہے پھر انتخاب کے بارے میں نقطۂ نظر کا فرق بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم مندرجہ ذیل کتابیں موجودہ دور میں مفید ہیں۔ فنون کے اعتبار سے آپ خود تقسیم فرمالیں۔ سیرۃ النبیؐ (علامہ شبلی مرحوم) ازالۃ الخفا (شاہ ولی اللہ) حجۃ اللہ البالغہ۔ حکیم الامت سیدی و مرشدی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی تصنیفات و مواعظ ـــــ "مذہب و عقلیات"۔ مولانا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہٗ۔ قادیانی مذہب۔ مولانا الیاس صاحب برنی مرحوم۔ ہدایۃ الممتری عن غوایۃ المفتری (مولانا عبد الغنی خاں صاحب مرحوم) (رد قادیانیت میں) منہاج السنۃ امام ابن تیمیہ۔

یہ چند کتابیں اسوقت ذہن میں آئیں وہ میں نے لکھ دیں۔ حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ کی کتابیں بھی بہت مفید ہیں۔ تدوین حدیث۔ مولانا مناظر احسن

صاحب گیلانی بھی قابلِ ذکر ہے۔
ان کے علاوہ بھی اس قسم کی مفید کتابیں
ہیں، مگر اس وقت سب مستحضر نہیں ہیں۔

علمی و مطالعاتی زندگی ——— ۲

محترمی ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم
یکم نومبر کو آپ کا دوسرا نوازش نامہ ملا جس میں
سوالنامے کے جواب کا تقاضا تھا۔ حقیقت یہ
ہے کہ آپ کے بعض سوالوں کا جواب نہایت
مشکل ہے۔ اشتغال اور موانع کی کثرت اجازت
نہیں دیتی کہ گذری ہوئی زندگی کا تحقق کے ساتھ
جائزہ لیا جاسکے۔ پھر مطالعہ کے حدود بھی متعین نہیں
ہیں۔ بہرکیف! بروقت بارِ خاطر سے سبکدوش
ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ نمبر دار جواب لکھتا ہوں۔
سوالوں کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

۱۔ ابتدائی کتابوں سے لیکر صحاح ستہ اور
تفسیر بیضاوی تک ساری کتابیں اپنے آنجہانی
والد محترم مولانا مفتی محمد امیر حسن بہاری سے پڑھیں
۱۹۱۲ء سے آپ صدر مدرس حمادیہ ڈھاکہ رہے۔
پھر ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۲ء تک ڈھاکہ یونیورسٹی
کے شعبۂ عربی و اسلامیات میں بنگال کے مشہور
محدث مولانا اسحٰق بردوانی کے بعد حدیث،
تفسیر اور فقہ کے لکچرار کی حیثیت سے بھی
اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ قبل اپنی تعلیم کے
اختتام کے بعد مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں دارالافتاء
میں سات سال تک مفتی رہ چکے تھے۔ نحو و صرف
اور فقہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ آنجہانی مولانا محمد سجاد
سکرٹری جمعیت علماء ہند اور آپ دونوں تا اختتامِ
تعلیم ساتھ ساتھ رہے۔ ڈھاکہ کے قیام میں ادب
عربی اور کتابت کی مشق کے لئے کچھ عرصہ تک میں
آنجہانی مولانا محمد حسین اعظمی مبارکپوری کے زیرِ تربیت
رہا۔ ان کی تعلیم سے ادبی ذوق میں نمایاں ترقی
ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں چند ماہ دیوبند میں مقیم رہا اس
عرصے میں دارالعلوم کی لائبریری اور آنجہانی مولانا
اعزاز علی کے ہدایہ اور دیوان متنبی کے اسباق
میں بالالتزام حاضر رہا۔

۲۔ اردو زبان میں مولانا ڈپٹی نذیر احمد، مولانا
عبدالحلیم شرر کے اخلاقی اور تاریخی ناولوں سے
بے حد متاثر ہوا۔ علامہ شبلی کی سیرت النبیؐ، الفاروق
، الکلام، النعمان، الغزالی، المامون سے (عربی
میں رفاعی کی عصر المامون تین ضخیم جلدوں سے)
نیز شعر العجم و موازنہ انیس و دبیر سے اور مولانا
ابوالکلام آزاد کی کتابوں اور مقالات سے بھی
شغف رہا۔ غالب کے خطوط اور حالی کی مسدس
اور دوسری نظموں کا گہرا اثر رہا۔

عربی کتابوں کے متعلق کچھ کہنا اس کم وقت
میں دشوار ہے۔

۳۔ روزنامہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خان کی
نظمیں اودھ پنچ کے مقالات نیز ساقی درویش

دہلی اور دلگداز لکھنؤ، کلکتہ کے البلاغ و الہلال
کے شمارے بہر دلعزیز رہے، معارف اعظم گڑھ
اور نقاد آگرہ نیز مولانا منظور نعمانی کے الفرقان
سے خاص شغف رہا۔

آج کل اردو فکر و نظر، بینات، البلاغ
الحق، المعارف، ترجمان القرآن، میثاق وغیرہ
علمی ادبی دینی ماہوار رسالے ہیں جو معیاری کہے
جانے کے مستحق ہیں۔ البتہ پاکستان بننے کے
بعد اردو زبان ایک انقلابی دور سے گذر رہی
ہے اور دوسری زبانوں کے اثرات اس پر
زیادہ غلبہ پا رہے ہیں کہ لکھنے والے اپنی اپنی
زبانوں کی خصوصیات کے تحفظ کی خاطر کبھی
دانستہ طور پر اور کبھی نادانستگی سے اردو زبان
کو قربان کر دیتے ہیں۔

۴۔ بچپن میں اپنی والدہ ماجدہ مرحومہ سے
نیز محلے کے ایک بزرگ صوفی منش مولوی محمد
امیر مرحوم سے، اللہ تعالیٰ دونوں کو غریق رحمت
کرے، حروف ابجد سے لیکر قرآن پاک کے
چند پارے تک کی تعلیم حاصل کرکے فارسی آمد نامہ
بھی پڑھنا شروع کیا تھا کہ آنجہانی والد بزرگوار
مولانا محمد امیر حسن نے اپنے ساتھ رکھنا مناسب
سمجھا۔ ڈھاکہ کے ابتدائی دور میں علاوہ فارسی
اور قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے مدرسہ کے
ساتھ ملحق مکتب میں بنگلہ زبان، بنگلہ درسیات
ساتھ ہی کچھ انگریزی کی تعلیم پائی، بعد میں عربی کی
درسیات باقاعدہ پڑھتا رہا۔ فاضل کے امتحان کے
بعد دیوبند میں چھ ماہ رہا، بعد ازاں جھوائی ٹولہ لکھنؤ
میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ پھر انگریزی کی تعلیم اور تاریخ
ادب عربی و انگریزی مقالہ نویسی میں ڈاکٹر سراج الحق ڈاکٹر
سید معظم حسین اور آنجہانی سید عبدالسبحان سے ڈھاکہ یونیورسٹی
میں دیگر اساتذہ کے علاوہ زیادہ مستفید ہوا۔
اول الذکر دونوں حضرات صدر شعبہ عربی و اسلامیات
رہ چکے ہیں اور ثانی الذکر عرصہ تک ڈھاکہ یونیورسٹی
کے وائس چانسلر رہے، فی الحال دونوں حضرات
حکومت پاکستان کے اسلامی مشاورتی کونسل کے
ممبر ہیں۔

آکسفورڈ کے قیام کے زمانہ میں پروفیسر
ایچ۔ آر گب اور ڈاکٹر رچرڈ والسر کے طریقہ تحقیق
اور علمی بحث و تمحیص سے بے حد متاثر ہوا۔

۵۔ ڈاکٹر مصطفی زرقا۔ شیخ شلتوت۔ شیخ
ابوزہرہ۔ مصطفی عبدالرزاق۔ محمد الغزالی مرحوم،
سید قطب وغیرہ کی مؤلفات جدید مسائل کو علمی
طریقے پر حل کرنے میں نہایت مفید ہیں۔

پاکستان میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
اور فقید الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نیز
مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
مولانا محمد امین اصلاحی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی
وغیرہ دیگر علماء کی تالیفات بھی کارآمد و مفید
ہیں۔

۶۔ قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ کو سیرت
نبوی اور اجلہ صحابہ کے حالات، زندگی کی روشنی

میں سمجھنا بہت سے فتنوں سے بچائے گا۔
پھر مستند علماء کی کتابیں بھی کار آمد ہیں۔ بشرطیکہ اللہ
تعالیٰ ہدایت کی توفیق دے۔

۷۔ سرسری طور پر کتابوں کا نام لینا دشوار
ہے۔ تفصیل کے لئے وقت نہیں۔

۸۔ مدارس عربیہ میں طرز تعلیم کے بدلنے کی
ضرورت ہے۔ نظام تعلیم کے متعلق اجمالاً عرض
ہے کہ احقر کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ یہ نظام
دین و دنیا دونوں کے لئے مفید ہو اور موجودہ
سارے رائج نظام دونوں کے لئے ناکافی ہیں۔
البتہ یہ کہنے میں باک نہیں کہ مدارس عربیہ کے
نصاب پر نظر ثانی کی ضرورت اس لحاظ سے
ہے کہ اس کو آج کل کے تقاضوں کو پورا کرنے
میں زیادہ سے زیادہ ممد و معاون بنایا جائے
تحریر و تقریر پر زور دینے کے علاوہ انفرادی
توجہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایسے مضامین کا
انتخاب بھی لازم ہے، جن کی ضرورت ہمارے
روزمرہ کی زندگی میں ہر ہر گام پر ہوتی ہے۔
یہ کام تو حکومت کا تھا کہ ایک نظام تعلیم
ملک میں رائج کرکے مختلف دفاتر اور شعبوں
کی ملازمتوں نیز تجارتی و کاروباری اداروں کو صرف
ایک نظام تعلیم کے تحصیلین کے لئے مخصوص
نہ کرتی اور سرکاری ملازمتوں کے مقابلہ کے امتحانوں
میں عربی مدارس کے طلبا کو بھی شریک ہونے کی
اجازت دیتی۔ دینی علوم کی ضرورت کے ساتھ
سائنس اور دنیوی علوم کو بھی اسلامی علوم میں داخل
سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ علمی زندگی میں اسلام
نظام تعلیم کی ثنویت کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ اگر
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت
رضی اللہ عنہ کو عبرانی سیکھنے کا حکم دیا تو آج علوم
جدیدہ اور یورپین زبانوں کے سیکھنے کو ہم برا نہیں
سمجھ سکتے بلکہ بین الاقوامی تقاضوں کے ماتحت
ان کے واجب علی الکفایہ ہونے سے انکار
نہیں کیا جا سکتا۔

آخر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ علوم دینیہ
کی تحصیل کسی خاص فکر و خیال کے ساتھ چپکنے کی
تلقین نہیں کرتی، اسلام تو رواداری کی تعلیم دیتا
ہے۔ اور عصبیۃ الجاھلیۃ کو سختی سے رد کرتا
ہے۔ پھر بجائے اللہ اور رسول کے فرمان پر عمل
کرنے کے، تعجب ہے کہ طلبا اپنے اپنے خاص
اساتذہ کی شدید متابعت کو اپنا دین و ایمان سمجھیں
اور اپنی آراء کے آگے دوسروں کی آراء کو ہیچ
سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا تقشف اور ایسی
تنگ خیالی صحیح علمی بصیرت نہیں سمجھی جا سکتی۔
اور دوسروں کی ان آراء کا احترام نہ کرنا جو دین سے
مختلف نہ ہوں کسی طرح اسلام کی تعلیم کے موافق
نہیں ۔۔۔۔۔۔

سوالنامہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ
فرمائیں

میری علمی و مطالعاتی زندگی

سوالنامہ

۱۔ آپ کو علمی زندگی میں کن کتابوں اور مصنفین نے متاثر کیا۔ اور آپ کی محسن کتابوں نے آپ پر کیا نقوش چھوڑے۔؟

۲۔ ایسی کتابوں اور مصنفین کی خصوصیّت۔

۳۔ کن مجلات اور جرائد سے آپ کو شغف رہا۔ موجودہ صحافت میں کون سے جرائد آپ کے معیار پہ پورے اترتے ہیں۔؟

۴۔ آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لئے، ایسے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف جن سے طلبار کی تعمیر و تربیت میں مدد ملی۔

۵۔ اس وقت عالم اسلام کو جن جدید مسائل اور حوادث و نوازل کا سامنا ہے۔ اس کے لئے قدیم یا معاصر اہل علم میں سے کن حضرات کی تصانیف کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔؟

۶۔ علمی اور دینی محاذوں پہ کئی فتنے تخریبی، الحادی اور تجددی رنگ میں (مثلاً انکارِ حدیث، عقلیت، اباحیت، تجدّد، مغربیت، قادیانیت اور ماڈرنزم) مصروف ہیں۔ ان کی سنجیدہ علمی احتساب میں کونسی کتابیں حق کے متلاشی نوجوان ذہن کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔؟

۷۔ موجودہ سائنسی اور معاشی مسائل میں کونسی کتابیں اسلام کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔

۸۔ مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب اور نظام میں وہ کونسی تبدیلیاں ہیں جو اسے موثر اور مفید تر بنا سکتی ہیں۔

امید ہے اپنے مفید خیالات سے محروم نہیں کیا جائیگا

★

قسط ۲

سیرتِ نبوی اور مستشرقین
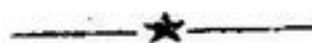
حضرۃ علامہ مولانا شمس الحق افغانی
شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

عقلی دلائل ۱۔ اگر یورپ کے قانون کے مطابق ایک مرد کے لیے صرف ایک بیوی کے ساتھ نکاح مختص ہو تو پھر فطرت اور قدرت کے لیے یہ ضروری تھا کہ ولادت میں ذکور واناث میں مساوات رکھی جاتی۔ یعنی لڑکے اور لڑکیاں کل عالم میں اور ہر جگہ مساوی تعداد میں پیدا ہوتے۔ تاکہ لڑکیوں کی تعداد بڑھنے نہ پاتے، اگر لڑکیوں کی تعداد پیدائش لڑکوں سے ایک فی ہزار بھی زائد ہو جاتی تو تین ارب انسانی آبادی میں ایک لاکھ لڑکوں کی پیدائش کے مقابلہ میں ایک لاکھ ایک سو، اور ایک کروڑ لڑکوں کے مقابلہ میں دس ہزار لڑکیاں زائد ہوں گی۔ اور ایک ارب کے مقابلہ میں دس لاکھ عورتیں فالتو ہوں گی۔ علیٰ ہذا القیاس۔

اب سوال ہو گا کہ یہ فالتو عورتیں جنسی فطری خواہش کی تکمیل کے لیے یا خلافِ فطرت تجرد پر مجبور کی جائیں گی۔ جو ہر دور میں اور بالخصوص اس دور میں ناممکن ہے۔ یا زنا کے ذریعہ ناجائز طریقہ سے اپنی خواہش پوری کریں گی۔ جو انسانی معاشرے کی تباہی کا موجب ہو گا۔ لہٰذا قانون تعدد نکاح کی صورت میں جو بشرط عدل اسلام میں موجود ہے، انکی فطری ضرورت کی تکمیل کی قانونی صورت پیدا ہو گی۔ بالخصوص آجکل جو عموماً عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے، انکی کھپت کے لئے اسلام کے فطری قانون تعدد نکاح کے سوا اور جائز راہ نہیں۔

۲۔ تعداد اموات میں بھی قدرت کے لئے مرد اور عورتوں کی مساوات ضروری تھی۔ موت کی صورت میں اگر یک زوجگی کا یورپی قانون قانون فطرت اور قدرتی ہوتا تو قدرت کا فرض تھا، کہ مردوں اور عورتوں کی قبض روح اور موت میں یکسانیت رکھتی۔ تاکہ توازن پورا رہے۔ ورنہ اگر مرد زیادہ مر جائیں اور عورتیں کم مریں تو اگر دونوں کی ولادتی تعداد برابر بھی ہو، تب بھی بڑی تعداد عورتوں کی بچ رہے گی۔ جن کے کھپانے کے لئے یورپی قانون میں جائز صورت کوئی نہ ہو گی۔ بہرحال یورپی قانون یک زوجگی کے تحت کارخانہ

قدرت کا فرض تھا کہ وہ شرح پیدائش واموات کے دفاتر بذریعہ ملائکہ پورے ملک اور صوبوں اور ضلعوں تک میں قائم کرتی۔ تاکہ یورپی قانونِ زوجگی کا توازن برقرار رہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا جس سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی قانون منشاء قدرت وفطرت کی ضد ہے۔ اور واجب الترک ہے۔

۳۔ جنگ بھی فطرتِ انسانی میں داخل ہے۔ انسانی افراد و اقوام قوتِ شہوت نزوعیہ (یعنی حب الوطنی) کے تحت فوائد ملک پر قبضہ کرنے کے لئے آلاتِ حرب کے ذریعہ دوسرے ملک پر حملہ کرتے ہیں۔ اور جس ملک پر حملہ ہوتا ہے، وہ مدافعت کیلئے جنگ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جسکی وجہ سے دونوں قوموں کی فوجیں قوتِ غضبیہ کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اور لاکھوں، کروڑوں آدمی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ یا بیکار ہو جاتے ہیں۔

جنگِ اوّل میں ایسے مقتولین وبیکار لوگوں کی تعداد چار کروڑ تھی۔ اور جنگ عظیم ثانی میں چھ کروڑ تعداد تھی۔ ایسی صورت میں اکثر مرد کام آجاتے ہیں۔ اور عورتیں بچ جاتی ہیں۔ فوج میں اکثر مرد ہیں، عورتیں نہ ہونے کے برابر۔ تو گویا گذشتہ دونوں جنگوں میں جو دس کروڑ آدمی ضائع ہوئے ان کے بالمقابل جو عورتوں کی تعداد بچ گئی۔ اسکو کہاں کھپایا جائے۔ جائز راستہ (تعدد نکاح) تو مغربی قانون میں بند ہے۔ یہ وقت اس صورت میں بھی باقی رہے گی، اگر قبل از جنگ مرد و زن کی تعداد برابر فرض کرلی جائے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ متعدد بیویوں میں بے انصافی ہوتی ہے، تو بے انصافی ایک بیوی کے ساتھ بھی کی جاتی ہے۔ لہذا ایک کی بھی بندش ہونی چاہیے۔

۴۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلی بیوی بیمار ہوتی ہے، اور مرض ممتد ہوتا ہے۔ یا حیض ونفاس کی صورت ہوتی ہے، یا بانجھ پن ہوتا ہے۔ اور شوہر کو فرزند اور جانشین کی فکر ہوتی ہے۔ اس صورت میں جنسی جذبہ کی ضرورت بھی اس بیوی سے پوری نہیں ہوتی۔ کیا ایسی صورت میں عقل کا تقاضا یہ نہیں کہ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لئے دوسری بیوی کو نکاح میں لانے کی قانونی گنجائش موجود ہو۔ یا پھر بھی یہی مناسب ہوگا کہ ان ضرورتوں کو کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے۔ اسلام نے جو دینِ فطرت ہے ان سب گذشتہ حالات کو پیش نظر رکھ کر بشرط عدل دوسری بیوی یا زیادہ کی چار بیویوں تک اجازت دی۔ اور سابق اقوام وادیان کی لاتعداد زوجات کو عدل کی شرط پر چار میں محدود کر دیا۔ یورپ میں آج کل شوہروں کی سپلائی کے لئے انجمنیں قائم ہیں۔ اور عورتیں پریشان پھرتی ہیں لیکن شوہر نایاب ہوتا جا رہا ہے ـــ یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے، اگر محمدی قانون پر عمل ہوتا۔ جیسا کہ مسیحی دنیا نے حالات سے مجبور ہو کر مسیحی قانون کو ترک کر کے طلاق میں محمدی قانون پر عمل کر کے مشکلات

کو حل کیا ۔ اور نبی امی کی صداقت ماننے پر مجبور ہوئے ۔ اسی طرح امریکہ نے بھی میڈیکل بورڈ کی تحقیقی رپورٹ کے بعد شراب کی صحتی، نفسیاتی، حیاتیاتی مضرات پر مطلع ہو کر ۱۹۳۷ء میں تحریم و بندش شراب کا قانون امریکہ میں نافذ کیا تھا ۔ لیکن ڈوبے لگام معاشرہ کو پابند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ۔ اب قانون تعدد زوجات پر اعتراض کا جواب ختم ہوا ۔

اعتراض کا دوسرا جزو کہ نیت پر اعتراض ۔ اس کا جواب دیا جاتا ہے ۔

تعدد زوجات پر پیغمبر اسلام علیہ السلام کی نیت پر اعتراض

مستشرقین سے مراد وہ یورپی متفکرین ہیں، جو علوم مشرقیہ بالخصوص علوم اسلامیہ کا مطالعہ اس خیال سے کرتے ہیں کہ اپنی تصنیفات کو بنام تحقیق علمی شائع کریں ۔ ان کی تصنیفات میں ایک بات تعصب پہ پردہ ڈالنے کی غرض سے قرآن، صاحب قرآن، اور اسلام کی تعریف میں بھی لکھ دی جاتی ہے ۔ اور بہت سی اسلامی کتابوں کے حوالے بھی درج کر دئے جاتے ہیں ۔ تاکہ مضمون مسلمان ناظرین کی نگاہ میں مقبول ہو جائے ۔ لیکن ساتھ ساتھ ایسی باتیں اور زہر شامل کر دئے جاتے ہیں کہ مسلمان اگر عیسائی نہ ہو تو کم از کم مسلمان بھی نہ رہے ۔ یعنی قرآن اور صاحب قرآن علیہ السلام اور اسلام کے متعلق ان میں تشکک اور تردد پیدا ہو ۔ اور عقیدہ کی پختگی زائل ہو ۔ بے شبہ اسلام کے خلاف مسیحی یورپ کا قلمی جہاد ہے ۔ کیونکہ تلوار کے جہاد سے وہ کامیابی نہیں ہو سکتی جو اس قلمی جہاد سے ہو سکتی ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود مسلمان برائے نام اسلام کا نام برقرار رکھ کر اسلام کو مٹا دینے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہی نسخہ اکسیر ہے ۔ جو مشرقی پاکستان کے ہندو استادوں اور پروفیسروں نے وہاں سکولوں اور کالجوں میں استعمال کیا ۔ اور اظہار ہمدردی کے لئے یہ مرچ مصالحہ بھی شامل کیا کہ مغربی پاکستان والے بنگالیوں کو لوٹ رہے ہیں ۔ بنگالیت کے جذبہ کو ابھارا ۔ اور اسلامیت سے نفرت دلائی یا بدظن کیا گیا ۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہمارے سامنے ہے لیکن مغربی پاکستان میں نصاب تعلیم اور اساتذہ تعلیم پر اب تک تجربے کے بعد بھی ہماری احتسابی نظر درست نہیں ہوتی ۔ ہم انہیں لایعنی جھگڑوں کے شکار ہیں ۔ مستشرقین کی یہ ساری دشمنی اسلام سے ہے نہ دیگر مذاہب مشرق سے ۔ یہی حال روسی سوشلزم کا ہے کہ اس کا نشانہ تیر بھی صرف اسلام ہے، نہ ہنود مذہب نہ بدھ، نہ مجوسیت، نہ مسیحیت ۔ اس کے چند وجوہ ہیں ۔

۱ ۔ اسلام کو وہ جاندار مذہب سمجھتے ہیں کہ اگر کسی وقت وہ زندہ ہوا تو بہت بڑی طاقت بن جائے گا جس کا مقابلہ مشکل ہے ۔

۲۔ اس میں عالمی مسائل کو حل کرنے کی وہ قوت و کشش موجود ہے، جو دیگر مذاہب میں نہیں۔ وہ مذاہب مردہ ہیں۔ اس لئے اسلام کے شیر کو مارا تو نہیں جا سکتا، سلا دینا ضروری ہے۔

۳۔ صلیبی جنگوں سے مسیحی اقوام کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے۔ جو ان سے جدا نہیں ہو سکتی، ان سب باتوں کے باوجود بعض مستشرقین حضور علیہ السلام کے متعلق بعض غلط بیانیوں کے انکار اور اصل حقیقت کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضور علیہ السلام نے جو متعدد شادیاں کیں، نفسانی جذبہ کی وجہ سے کیں، یا دیگر مصالح کی وجہ سے ہم چند مؤرخین یورپ کے حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں، جنہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ یہ نکاح نفسانیت کی غرض سے نہیں ہوئے۔

۱۔ ڈی۔ ایس مارگولیتھ | یہ بڑا تنگ نظر اور متعصب نکتہ چین ہے۔ لیکن وہ اپنی کتاب "محمد اینڈ دی رائز آف اسلام" میں لکھتا ہے کہ بہت سے مصنفین یورپ کے نزدیک خدیجہؓ کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی متعدد شادیاں نفسانی خواہشات کے تحت تھیں، مگر وہ اس قسم کی نہ تھیں، کئی شادیاں سیاسی مصلحت کی بنا پر کی گئی تھیں۔ پیغمبر اپنے معتقدین کو اپنے قریب ترین کرنا چاہتے تھے۔ یہ وجہ ابوبکر و عمر کی لڑکیوں عائشہ و حفصہ سے شادی کرنے کی تھی، سیاسی مخالفین یا مغلوب دشمنوں کی لڑکیوں سے شادیاں سیاسی مقصد کے تحت دوسری نوعیت کی تھیں۔ باقی شادیوں کی وجہ یہ تھی کہ کوئی لڑکا نہ تھا۔

۲۔ آر باسورتھ سمتھ کے چار لیکچر ۱۸۷۴ء میں جو "محمد اینڈ محمڈنزم" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، کہتا ہے کہ دوسرے مقاصد کے علاوہ محمد کے اکثر و بیشتر شادیوں کے مقاصد بے سہارا افراد پر ترس کھانا تھا۔ تقریباً سب ہی بیوائیں تھیں، جو نہ خوبصورت تھیں نہ دولتمند خدیجہؓ کے وقت رحلت تک خود پچاس سال کی عمر کے تھے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ زینب کی کہانی میں رنگ آمیزی کی گئی زینبؓ پیغمبر کی پھوپھی کی بیٹی تھی۔ اور بجائے آزاد غلام سے ان کی شادی کر دینے کے خود ان کے ساتھ شادی کرنے میں رکاوٹ کوئی نہ تھی جب وہ اور یہ دونوں جوان تھے۔

۳۔ "ہیروز اینڈ ہیروز ورشپ" میں یورپ کا مشہور مصنف کارلائل لکھتا ہے: "محمد نفس پرست انسان نہ تھے۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہو گی کہ اس شخص کو ایک عام بندۂ ہوس تصور کریں۔ یہ شخص کیف اور حظ نفس پہ گرنے والے نہ تھے، ان کے گھر کا ساز و سامان بادشاہی حاصل ہونے کے باوجود غریبانہ تھا۔ ان کی خوراک جو کا آٹا اور پانی تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ مہینوں ان کے گھر آگ نہیں جلی، وہ اپنے جوتے آپ گانٹھ لیتے تھے اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگاتے تھے، ایک غریب محنتی،

مستغنی انسان ان تمام رجحانات سے بے نیاز جن پر عام سطح کے آدمی مرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کا آدمی بندۂ ہوس نہیں ہو سکتا۔ اس کے جذبات ہوس سے بلند ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایسے ہوتے تو وحشی عرب جو ۲۳ سال اس کے اشاروں پر جان پر کھیلتے رہے۔ اور عمر بھر اسے قریب سے دیکھتے رہے، اسکی تعظیم نہ کرتے، وہ بات بات پر کٹ مرنے والے وحشی تھے۔ ایسے لوگوں سے اپنی اطاعت کرانا کسی عام آدمی کا کام نہ تھا۔ وہ انہیں رسول کہتے تھے۔ اس لئے ان کی ساری زندگی ان کے سامنے بے نقاب تھی۔ اس میں کوئی راز نہ تھا، سیدھی سادھی زندگی کبھی وہ ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہیں۔ کبھی مشاورت میں۔ کہیں ان میں کھڑے ان سے اطاعت کرا رہے ہیں، انہیں انہوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قسم کے انسان ہیں۔ اس لئے وہ ان کو پیغمبر کہتے تھے۔ کوئی شہنشاہ اپنی خلعت فاخرہ میں ملبوس ہو کر لوگوں سے اس قسم کی اطاعت نہیں کرا سکتے جس قسم کی اس انسان نے کرائی۔

۴۔ لین پول لائف آف محمد" میں لکھتے ہیں۔ یہ کہنا کہ محمد بندۂ ہوس تھے، غلط ہے۔ ان کی روزمرہ کی زندگی ان کا تخت بوریا جس پر وہ سوتے تھے۔ ان کی معمولی غذا، کمتر سے کمتر کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا۔ ظاہر کرتا ہے کہ وہ نفسانی خواہشوں سے بلند و بالا تھے۔ ان کی متعدد شادیاں ان بیواؤں سے ہوئیں جن کے شوہروں نے میدان جنگ میں اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ وہ محمد کی کشادہ دلی سے اپنی حفاظت و پناہ کا حق رکھتی تھیں۔ باقی شادیاں مصلحت کی بناء پر کی گئیں۔ مخالفین کے سرداروں کو مسخر کرنے کے لئے سب سے بڑا سبب بیٹے کی تمنا تھی، جو ان کے قدم بقدم چلے۔ سب سے پہلا ثبوت ان کی پہلی بیوی خدیجہؓ کے ساتھ ان کی وفا شعاری ہے کہ شروع سے آخر تک اس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ ہلکی سی بھی لغزش نہ ہوئی۔ خدیجہؓ کے بعد اگرچہ انہوں نے متعدد شادیاں کیں لیکن انہیں کبھی نہ بھولے۔ اور آخر وقت تک یاد رکھا۔ یہ محبت بھری یاد ایک شریف الطبع انسان ہی میں ہو سکتی ہے۔ نہ ایک بندۂ ہوس میں۔

جدید دشمنوں کا اقرار یہ حوالجات ان مخالفین اسلام مورخین یورپ کے ہیں۔ جو پیغمبر اسلام علیہ السلام کی زندگی پر سخت سے سخت تر تنقید کے عادی ہیں، انہوں نے بھی تاریخی واقعات سے مجبور ہو کر حضور علیہ السلام کی ذات کو ہوا و ہوس و عام خواہشات کی دنیا سے بلند مقام عطا کیا۔ یہ تو جدید دشمنوں کا اقرار ہے۔

قدیم دشمنوں کا اقرار قدیم دشمنان پیغمبر اسلام جن کی تمام کوششیں اور جان و مال کی ساری

قربانیاں صرف اس لئے تھیں کہ آپکو ناکام کر کے لوگوں کی نظروں میں غیر مقبول بنائیں۔ لیکن ان دشمنوں میں سے کسی ایک دشمن نے بھی حضور علیہ السلام کے متعلق ہوا و ہوس یا خواہش پرستی کا ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔ ورنہ مستشرقین کے لئے صرف وہی حرف نقل کر دینا اثبات مقصد کیلئے کافی تھا۔ اور اپنی طرف سے الزام تراشنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سلسلے میں بدترین دشمن ابو سفیان اور اس کے قریشی ساتھیوں کا مجمع عام میں وہ بیان جس سے آپ کی عزت مآبی اور امانت داری کا واضح ثبوت ملتا ہے، شہادت کے لئے کافی ہے۔

واقعات تاریخ؛ خود حضور علیہ السلام کی زندگی خواہشات نفس کی ضد ہے۔ ہوس اور خواہش نفس ناقابل تقسیم جذبہ ہے۔ نفس کو مالؔ کی خواہش ہوتی ہے۔ عمدہؔ لباس کی خواہش ہوتی ہے۔ عمدہؔ مکان کی، عمدہ خوراکؔ کی۔ مجالس میں عمدہ نشستؔ کی بھی۔ دشمنوں سےؔ انتقام کی بھی۔ اور بیویوںؔ کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ عمدہ سواروں، راحتؔ و آرام اور مقام عزت کی خواہش ہوتی ہے۔

ان چیزوں پر اگر منصفانہ نگاہ ڈالی جائے، تو عین اس وقت کہ آپ کو عرب کی دس لاکھ مربع میل کی سلطنت پر اقتدار حاصل تھا کسی وقت بھی آپ کے پاس مال نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ نے ایک درہم نہیں چھوڑا۔ ایک بار نماز سے فارغ ہو کر جلدی سے گھر میں تشریف لے گئے۔ صحابہؓ حیران تھے کہ کیا بات ہے۔ واپس آکر آپ نے بتایا کہ گھر میں کچھ مال تھا۔ اسکو تقسیم کرنے کا حکم فرما آئے ہیں۔ کیونکہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ موت آئے۔ اور گھر میں مال موجود ہو۔ آپ کا لباس غریب عوام کی طرح تھا۔ اگر کسی وقت کوئی اچھی چادر یا کپڑا کسی نے پیش کیا اور کسی کو پسند آیا یا مانگا تو فوراً اتار کر دے دیا۔ مکان کیا تھا مٹی کی چھوٹی چھوٹی دیواروں پر کھجور کی شاخیں ڈال کر اس کے نیچے عمر بھر سوتے رہے۔ گھر میں چراغ تک نہ تھا۔ بارش میں چھپر کے اوپر ٹاٹ ڈالا جاتا تھا۔ مجالس میں آپ کی مخصوص نشست نہ تھی۔ عام آدمی جب باہر سے آتا تو پیغمبر اور ان کے جاں نثاروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا۔ خوراک کا یہ عالم تھا کہ گھر کی واقف حال بیوی حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ تین تین ماہ تک اس شاہ دو جہاںؐ کے گھر میں آگ نہیں سلگتی تھی۔ پانی اور چند دانے خرما پر گذارہ تھا۔ بعض اوقات بھوک سے بے تاب ہو کر پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے کہ بھوک کا احساس نہ ہو۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کے پورے کنبے کو دو دن مسلسل کبھی پیٹ بھر کر جو کی روٹی میسر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ حضورؐ وصال فرما گئے۔ دشمنوں سے انتقام کا یہ حال تھا

کہ اہل مکہ جیسے بدترین دشمنوں کے تیرہ سال کے مظالم سے تنگ آکر آپ نے مکہ جیسے مقدس وطن کو چھوڑا تھا، فتح مکہ کے موقع پر وہ پا بہ زنجیر قیدیوں کی صورت میں جب آپ کے سامنے پیش کئے گئے تو آپ نے فرمایا تم سب آزاد ہو۔ اور میں تم کو ملامت تک بھی نہیں کرتا کیا اس سے بڑھ کر نفس کشی اور خواہش کو پامال کرنے کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں مل سکتی ہے۔ سواری کا یہ حال تھا کہ جب اونٹ کم ہوتے تھے اور دو دو تین تین باری باری سے ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو آپ بھی خود اس میں شامل ہوتے تھے، جب آپ کی نوبت میں رفیق سواری عرض کرتا کہ آپ سوار ہو جائیں۔ میں آپ کے بدلے میں پیدل چلونگا، تو آپ یہ فرماکر سواری سے اتر کر پیادہ چلتے کہ تم مجھ سے قوی نہیں۔ اور میں تم سے اجر و ثواب کی خواہش کم نہیں رکھتا۔ راحت طلبی نہ تھی۔ چنانچہ یہ حال تھا کہ اکثر اوقات مشغولیت کے باوجود مکان پر دربان نہ تھا۔ ہر وقت ہر کوئی مل سکتا تھا۔ دن کو اکثر روزے، رات کو خدا کی عبادت، فوجی سپہ سالار بھی خود، چیف جسٹس بھی خود۔ معلم اور استاد بھی خود۔ عزت اور وقار پرستی نہ تھی۔ چنانچہ یہ کیفیت تھی کہ صحابہؓ کے ہمراہ جب چلتے تھے تو سب سے پیچھے چلتے تھے۔ اور جب مجلس میں آتے تھے تو کوئی صحابی تعظیم کے لئے نہیں اٹھتا تھا، کیونکہ آپ نے منع فرمایا تھا کہ میرے لئے کوئی کھڑا نہ ہو، لہٰذا جان نثار صحابہؓ تعمیل حکم سے مجبور تھے۔ یہ سب امور ایسے ہیں کہ جس ذات میں رائی کے دانے کے برابر خواہش نفس ہو وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتا۔ اب صرف متعدد بیویوں کا مسئلہ رہ گیا۔ اس کو جدا عنوان سے بیان کرتے ہیں۔

تعدد زوجات اس پر ہم دو طرح بحث کرتے ہیں، ایک بحیثیت مجموعی دوم انفرادی حیثیت سے مجموعی حیثیت سے یہ تحقیق کرنا ہے۔ کہ جب دلائل سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضور علیہ السلام کے تعدد زوجات میں قطعاً شائبہ نفسانیت شامل نہ تھا۔ کیونکہ آپ کی پوری زندگی نفسانی خواہش کے خلاف جہاد کا نمونہ تھی، اور اس وجہ سے بھی اگر تعدد زوجات میں نفسانی خواہش کا دخل ہوتا تو آپ نوجوان حسیناؤں کا انتخاب کرتے۔ لیکن آپ کی جملہ زوجات بجز ایک کے سن رسیدہ اور بیوائیں تھیں۔ اس کے علاوہ نفسانی جوش کا زمانہ جوانی کا ہوتا ہے۔ لیکن جوانی سے لیکر ۵۲ سال کی عمر تک آپ نے ایک بوڑھی بیوہ عورت کے نکاح پر اکتفاء کیا۔ اس کے بعد بڑھاپے اور قریب الوصال وقت میں تعدد کی نوبت آئی۔

تعدد زوجات کا اصل سبب تعلیم دین تھا سبب اول :- اس تعدد زوجات کا منشاء لانا

کوئی اور تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ حضور علیہ السلام کا قول و عمل امت کے لئے ہدایت کا سامان اور نمونۂ عمل تھا، بلکہ تمام عالمِ انسانی کے لئے۔ کیونکہ آپ کی نبوت لیکون للعالمین نذیرا و رحمۃ للعالمین کی حیثیت سے بین الاقوامی تھا۔ اور دروازۂ نبوت کی بندش کی وجہ سے آپ کے ایک ایک قول و عمل اور اندرون خانہ زندگی کا کردار اور ازواج مطہرات سے آپ کا طرزِ معاشرہ ادائے حقوق اور اخلاقی زندگی کا پورا نقشہ امت کے مرد اور عورتوں، شوہروں اور بیویوں دونوں کے لئے واجب العمل نمونہ تھا۔ اور اسی نمونہ کے قالب میں اپنی زندگی کو ڈھالنا لازمی تھا۔

لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ۔ یقیناً تمہارے لئے حضور علیہ السلام کے قول و عمل اور طرزِ زندگی میں انسانیتِ کاملہ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس وجہ سے ایک ایسے ادارہ کا قیام ضروری تھا۔ جو اس داخلی زندگی کی تعلیم کے لئے ازواج کے ذریعہ وجود میں آیا، کیونکہ اسلام کے قانون حجاب کے تحت پیغمبر اسلام علیہ السلام سے امت کی اجنبی عورت نہ بے حجابانہ مل سکتی تھی۔ اور نہ پابندیٔ قانون پردہ کے تحت حضرۃ علیہ السلام اجنبی عورتوں سے مل سکتے تھے، اور نہ ہی اندرونِ خانہ زندگی رسالت کے مشاہدہ کی صورت ہو سکتی تھی۔ اس لئے تکمیل تعلیم دین کے لئے منشاءِ الٰہی نے یہ انتظام کیا کہ ایسی عورتوں کا مختلف طبقات میں سے انتخاب ہو کہ وہ طہارتِ نفس، پاکیزگی قلب اور فہم دین میں امتیازی شان رکھتی ہوں تاکہ وہ حضور علیہ السلام سے علوم دینیہ اور اسوہ نبویہ بالخصوص مستورات سے متعلقہ مسائل کو حاصل کر سکیں۔ اور صحیح سمجھ سکیں۔ اور امت کو عموماً اور مستوراتِ امت کو خصوصاً ان کی تعلیم دے سکیں۔ تاکہ حضور علیہ السلام کی تعلیم کو مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر پہنچانے اور ابلاغ میں آسانی ہو۔ اور گھر کے اندر کے احوال اور بالخصوص زوجات کے حقوق اور حسنِ معاشرہ کا صحیح نمونہ امت کو معلوم ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خدیجہؓ کے بعد ازواج مطہرات کا انتخاب بھی حضور اکرمؐ نے خود نہیں کیا بلکہ وحی الٰہی سے ہوا کہ اس کام کی صحیح اہلیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ اور زینبؓ بنت خزیمہ نے حضور علیہ السلام کی زندگی میں وفات پائی اور نو بیویاں حضور علیہ السلام کی وفات کے وقت تھیں۔ یہ حدیث ملاحظہ ہو۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما تزوجت شیئاً من نسائی ولا زوجت شیئاً من بناتی الا بوحی جاءنی بہ جبریل عن ربی عز وجل۔ اخرجہ عبد الملک ابن محمد لبسند کا عیون للاثر ج ۲ صفحہ ۳۰۰ و زرقانی ج ۳ صفحہ ۲۱۹

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ زمانۂ نبوت کی ازواج مطہرات کا انتخاب اللہ تعالیٰ

نے فرمایا۔ آپ کی خواہش نفس کو اس میں دخل نہیں تھا۔ اس لئے بجز ایک حضرت عائشہؓ کے سب عمر رسیدہ اور بیوہ منتخب ہوئیں۔ کہ کار تبلیغ و تعلیم دین کی پوری اہلیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا ہے۔ جیسے نبی کا انتخاب خدا کرتا ہے۔ زوجیت نبی کا انتخاب بھی خدا نے کیا۔ کیونکہ مقصد نبوت کی اہلیت اور مقصد زوجیت نبوت کا صحیح علم صرف خدا کو ہے۔ اس ادارۂ ازواج کا فائدہ یہ ہوا کہ نبوت محمدی کے بہت سے علوم ازواج مطہرات کے ذریعہ امت کو پہنچے ورنہ امت ان علوم سے محروم ہوتی۔

سبب دوم :- پھر ان ازواج مطہرات کی ذوات قدسیہ میں شدت تعلق کی وجہ سے جو اخلاق زکیہ و فضائل و محاسن حضور علیہ السلام سے منتقل ہوئے وہ پوری امت اور امت کی مستورات کے لئے نمونۂ عمل ہیں۔ کتب سیر و رجال میں ان ازواج مطہرات کی عبادت، روزے، تلاوت قرآن، ذکر اللہ، سخاوت، ترک محبت مال، قناعت، فکر آخرت اتباع شریعت کے جو احوال درج ہیں، انکو دیکھ کر ایمان قوی ہو جاتا ہے۔ اس لئے قرآن پاک نے فرمایا: وازواجہ امھاتھم۔ کہ حضور علیہ السلام کی بیویاں امت کی مائیں ہیں۔ جیسے حضورؐ امت کے باپ ہیں۔ یعنی جیسے ایمان کی تازگی و حیات میں احوال نبی کو دخل ہے۔ احوال زوجات نبی کو بھی دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لستن کاحد من النساء۔ تم (زوجات پیغمبر) دیگر عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ بلکہ تمہارا مقام بہت بلند ہے۔

سبب سوم :- دین حق و عدل الٰہی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کینہ پرور عربوں کے انتقامی جذبات کا فطری جوش تھا۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ تعلیم امت کے لئے دائرۂ زوجیت میں جن مستورات کا انتخاب ہو۔ ان سے مقصد تعلیم امت کے علاوہ ان زخموں کی بھی مرہم پٹی کی جائے جو مقابلہ دین حق میں ان کے خاندانوں کو پہنچ چکے ہیں۔ اور ان کا سبب اگرچہ ان کے اپنے کئے ہوئے جرائم و اعمال ہی تھے۔ مگر ان بااثر و قوی خاندانوں کی وجہ سے جو اشاعت حق کی راہ میں ایک تاریخی عداوت اور انتقام کیش کی فضا پیدا ہو چکی تھی، جسکا دور کرنا ضروری تھا۔

جویریہؓ | اس سلسلۂ انتخاب میں حضرت جویریہ بنت حارث آتی ہیں۔ جن کا پہلا نکاح مسافع بن صفوان سے ہوا تھا۔ جو غزوہ میں مارا گیا تھا۔ یہ ایک طاقتور قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں۔ قید ہو کر آئیں۔ اور ثابت بن قیس کے حصہ غنیمت میں آگئیں انہوں نے ان سے مکاتبت کر لی۔ یعنی یہ کہ آپ اتنی رقم ادا کر دیں، تو آپ آزاد ہو جائیں گی۔ یہ رقم کی

ادائیگی کے سلسلے میں حضورؐ کے پاس حاضر ہوئیں، آپ نے فرمایا اگر رقم میں ادا کر دوں اور آزاد کر دوں۔ اور پھر میں خود تم سے نکاح کر لوں تو نکاح پر تم راضی ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں راضی ہوں۔ (ابوداؤد۔ کتاب العتاق) اتفاق سے ان کے باپ حارث آئے انہوں نے کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں رہ سکتی۔ آزاد کر دیں۔ آپ نے فرمایا میں اسکو جویریہ کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ جویریہ نے فرمایا میں اللہ اور رسول کو اختیار کرتی ہوں۔ (رواہ ابن المنذر بسند صحیح جلد ۴ ص ۳۶۵)

ام حبیبہؓ تیسری زوجہ مطہرہ ام المؤمنین ام حبیبہؓ ہیں۔ جو اسلام کے خلاف اکثر لڑائیوں کے کمانڈنگ افسر اور قریش کے سردار ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ان کی ماں حضرت عثمانؓ کی پھوپھی صفیہؓ بنت ابی العاص تھیں۔ ان کا پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ حضرت ام حبیبہؓ خود بھی مسلمان ہوئیں۔ اور ان کی تبلیغ سے ان کے شوہر بھی مسلمان ہوئے۔ اس وقت ان کے باپ ابوسفیان اور بھائی معاویہ جو اسلام کے دشمن تھے، دونوں ان کو اسلام لانے پر ستاتے رہے، تنگ آکر دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہاں کچھ مدت کے بعد شوہر عبید اللہ بن جحش نصرانی ہو گیا، لیکن ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں۔ حضورؐ کو اطلاع ہوئی۔ آپ نے متاثر ہو کر سوچا تو آپ کو ان کی اس استقامت کا خیال آیا کہ انہوں نے اپنے سردار باپ کی دشمنی مول لیکر افریقہ کے ملک میں پناہ لی۔ پھر شوہر اس عیسائی ملک میں مرتد ہو کر مر گیا۔ لیکن ام حبیبہؓ کی ایمانی استقامت میں فرق نہ آیا، یہ دونوں امور ایسے ہیں کہ اس صورت میں بے سہارا مستورہ کو سہارا ملنا چاہیئے۔ دوم یہ کہ اس طرح ان کے باپ اور خاندان کی اسلام دشمنی میں کمی بھی آجائے گی۔ یہ دو اہم سبب ہوئے کہ آپ نے ام حبیبہؓ کو شرف زوجیت نبوی سے نوازا۔ حبشہ کے بادشاہ کو جو مسلمان ہو چکے تھے، حضورؐ نے اپنے قاصد کے ذریعے پیغام بھیجا کہ ام حبیبہؓ کو میری طرف سے پیغام نکاح پہنچا دو۔ چنانچہ یہ پیغام پہنچا دیا گیا۔

یہ بشارت سن کر بادشاہ کی اس باندی ابرہہ کو جس نے یہ پیغام پہنچایا تھا، ام حبیبہؓ نے اپنے ہاتھوں کے دو کنگن اور پاؤں کے پازیب اور انگلیوں کے چھلے انعام میں دئیے۔ اور نکاح ہو گیا۔ مہر نکاح چار سو پونڈ بادشاہ نے حضور علیہ السلام کی طرف سے مہر میں دے دئیے۔ اور سامان بھی دیا۔ ــــــــ

صفیہؓ چوتھی بیوی صفیہ بنت حیی بن اخطب ہیں، اس سلسلہ میں صفیہؓ بھی شرف زوجیت سے مشرف ہوئیں، جو بنی نضیر کے یہودی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں، جن کا پہلا نکاح سلام بن مشکم

سے ہوا تھا۔ اس نے طلاق دی۔ اس کے بعد دوسرا نکاح کنانہ بن ابی العقیق سے ہوا۔ وہ غزوہ خیبر میں مقتول ہوا۔ صفیہ قید ہوکر آئیں۔ حضورؐ نے آزاد کرکے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ صفیہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں اس نکاح سے بے سہارا صفیہ کی دلجوئی بھی ہوئی۔ اور اس کا اظہار بھی مقصود تھا کہ حضورؐ کو یہود سے ذاتی عداوت نہیں۔ تاکہ عداوت یہود میں کمی آجائے۔

زینبؓ | پانچویں بیوی زینب بنت حجش تھیں۔ یہ حضورؐ کی پھوپھی امیمۃ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ عرب کا دستور تھا کہ متبنیٰ یعنی لے پالک بیٹے کو اصلی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ اور اسکی بیوی سے بصورت موت یا طلاق بعد از عدت بھی نکاح حرام جانتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر کسی پر غاصبانہ وظالمانہ طریق پر غلامی کا داغ لگ جاتا تھا۔ تو آزادی کے بعد بھی کسی شریف عورت کو اس کے نکاح میں دینے کو عار سمجھا جاتا تھا۔ ان دو رسموں کو عملی طور پر توڑنے کے لئے منشاء الٰہی کے تحت حضور علیہ السلام نے ان کا نکاح اپنے متبنیٰ لے پالک زید بن حارث سے کرنا چاہا لیکن چونکہ ایسا کرنا رواج عرب کے خلاف تھا۔ زینبؓ شریف خاندان سے تھیں۔ اور حضورؐ کی پھوپھی زاد تھیں۔ زینب اور ان کے بھائی عبداللہ بن حجش جو دونوں مسلمان تھے، ان سے جب حضور اکرمؐ نے تذکرہ کیا۔ تو انہوں نے زید بن حارث آزاد کردہ غلام سے نکاح زینبؓ کو گوارا نہیں کیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وماکان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللّٰہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللّٰہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔ اس آیت میں مومن اور مومنہ زینبؓ اور ان کے بھائی مراد ہیں۔ یعنی مومن مرد یا عورت کے لئے درست نہیں کہ جب اللّٰہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کریں تو وہ اس پر راضی نہ ہو۔ اور جو کوئی اللّٰہ ورسول کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں جا پڑا۔ اس آیت کے نزول پر زینبؓ اور ان کے بھائی نکاح پر راضی ہو گئے۔ اور نکاح ہو گیا۔ لیکن خاندانی برتری کا تصور چونکہ باقی تھا، دونوں میں موافقت نہ ہوسکی حضرت زید جب شکایت حضورؐ کے پاس لے جاتے اور طلاق کا ارادہ ظاہر کرتے، تو حضورؐ اس خفگی پر صبر کی تلقین کرتے۔ اور طلاق دینے سے منع فرماتے۔ یہ خیال تھا کہ ایک تو آزاد کردہ غلام سے نکاح کے عار کو برداشت کیا۔ اب اگر طلاق دی گئی تو طلاق کا عار بھی لگ جائے گا۔ تو زیادہ ناراضگی پیدا ہوگی۔ پھر جب موافقت ناممکن ہوگئی تو زید نے طلاق دیدی۔ طلاق کی عدت جب گذری اور اللّٰہ کا منشاء ایک دوسری رسم جاہلیت کے ازالے کا ہوا۔ کہ خود حضورؐ کے عمل سے اس رسم جاہلیت کو منہدم کیا جائے۔ تو حضورؐ کو اگرچہ منشاء الٰہی کی تکمیل سے عذر نہ تھا۔ لیکن یہ خیال رہا کہ عرب میں

بدنامی ہوگی۔ کہ وہ لوگ منہ بولے بیٹے کی جورو کو حرام کہتے تھے۔ اور حضورؐ خود منہ بولے بیٹے کی جورو کو گھر میں رکھ لیں۔ پھر حضورؐ کے دل میں خیال آیا کہ حضرت زینبؓ اور ان کے خاندان کو رواج عرب کے مطابق دو قسم کی رسوائی ہوئی۔ ایک آزاد کردہ غلام سے نکاح کی، دوم طلاق کی۔ لیکن منشاء الٰہی تھا کہ اس زخم رسوائی کا مداوا ہو، جس کے لئے بہترین مرہم صرف یہ ہو سکتا تھا کہ حضور علیہ السلام خود زینبؓ کو اپنی زوجیت کا شرف بخشیں۔ لیکن ساتھ ہی عرب کی اس رسوائی کا ڈر تھا۔ کہ یہ طعن دیا جائے گا کہ آپ نے (لے پالک) بیٹے کی جورو سے نکاح کیا۔ کیونکہ عرب لوگ متبنیٰ کو بیٹا ہی سمجھتے تھے۔ لیکن منشاء الٰہی کے تحت آپ نے عمل فرمایا اور اس جاہلانہ قدیم رسم کا انقطاع فرما دیا۔ حضورؐ کے اس نکاح سے معاشرتی نظاموں کی اصلاح ہوئی۔ اور مساوات بشری کی ایک عمدہ نظیر بھی قائم کی گئی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مستشرقین نے صلیبی جنگوں کی موروثی عداوت سے جھوٹے اور بے سند اضافے کر کے اسکو عشقیہ داستان بنایا، گویا آپ اس نکاح کے لئے بیتاب تھے۔ اس متعصبانہ غلط الزام تراشی کی تردید کے لئے صرف یہ کافی ہے کہ حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں بچپن کے زمانے سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے، حضور علیہ السلام نے خود ہی ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثؓ سے کرایا۔ جو انکو ناگوار بھی گذرا۔ لیکن پھر خدا و رسول کے حکم کی مجبوری سے نکاح پر راضی ہوئیں، میں کہتا ہوں کہ اگر حضور علیہ السلام اس نکاح کے لئے بے قرار تھے تو مکہ معظمہ میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد خود ان سے نکاح کر لیتے۔ یا بعد از ہجرت جب آپ نے ان کا سنہ ۳ھ میں زیدؓ سے نکاح کرانا چاہا تو زیدؓ بن حارث کی بجائے خود ان سے نکاح کر لیتے۔ وہ کم نسبی کی وجہ سے زیدؓ کے نکاح سے راضی نہیں تھیں تو خود ان سے نکاح کر لینے میں کیا رکاوٹ تھی، اور اب بیوہ ہونے کے بعد نکاح میں کیا کشش تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ مسیحی استشراق کی غلط داستان ہے۔ جو سراسر عقل کے خلاف ہے۔

آپ کے حق میں چار سے زائد نکاح اور امت کے حق میں چار نکاح کے فرق پر اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ہر مذہب میں:

ا۔ سپیشل قانون موجود ہے۔ چنانچہ بائبل کے بموجب حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب کہ وہ حضرت مریمؑ سے بلا باپ پیدا ہوئے ہیں۔ یہ نسب خود آپ کے حق میں درست اور ثابت ہے۔ اور عام ضابطہ میں دیگر انسانوں کے لئے یہ قانون نہیں، گویا یہ قانون صرف حضرت مسیح سے مختص ہے۔ حضرت مسیح کی ولادت بلا باپ ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی و اسرائیلی

کو باہم دست و گریباں دیکھا تو قبطی کو مکہ مار کر ہلاک کیا۔ کتاب استثنار باب ۲۱۔ کیا یہ قتل روا تھا یا ناروا۔؟ اگر جائز ہے، تو بائبل سے ثابت کرو۔ اگر ناروا ہے تو کیا حضرت موسیٰؑ کی نبوت اس سے داغدار نہیں ہوئی۔ اگر نہیں ہوئی تو اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور حضرۃ موسیٰؑ کا قتل استثنائی اور اسپیشل قانون تھا۔ اسی طرح چار سے زائد بیویوں کا حضور علیہ السلام کے حق میں کیونکر استثنائی قانون نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر اعتراض کیوں ہے۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ چار بیویوں میں بشرط عدل انحصار کا قانون سنہ ۸ھ میں آیا ہے۔ جیسے محمد حسین ہیکل نے حیات محمد میں اس کی تصریح کی ہے۔ اور حضور علیہ السلام کی بیویوں کا نکاح آٹھ ہجری سے قبل یعنی قانون مثنیٰ وثلث ورباع سے پہلے وجود میں آیا ہے۔ قانون اربعہ سے قبل امت کے لئے بھی چار سے زائد کی اجازت کہ قانون اربعہ کے نزول سے قبل فرق ہی نہ تھا۔ نبی اور امتی سب کے لئے چار سے زائد کی بندش نہ تھی۔

اس پر اگر یہ اشکال کیا جائے کہ نزول قانون اربعہ کے بعد زائد بیویوں کو الگ کر دیا گیا ہے۔ جیسے ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔ تو حضور علیہ السلام بھی امت کی طرح چار بیویاں جن کا نکاح مقدم تھا۔ ان کو چھوڑ کر باقی کو الگ کر دیتے، تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ اس میں نبی اور امتی میں فرق کیا گیا۔ کیونکہ امہات المؤمنین شرف زوجیت کی وجہ سے اگر الگ کر دی جاتیں تو ان کے ساتھ نکاح کسی اور کا حرام ہوتا۔ ولا تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا کے تحت۔ (باقی آئندہ)

بقیہ: مولانا سید محمد یوسف بنوری ــــــ اس وقت سے لیکر اب تک آپ اسی دار العلوم کے شیخ الحدیث چلے آرہے ہیں۔ دیگر کتب احادیث کے علاوہ بخاری شریف آپ ہی پڑھاتے ہیں۔

سیاسی مسلک | فراغت کے بعد ہی آپ سیاست کے میدان میں آگئے۔ جمعیۃ علمائے سرحد کے تقریباً آٹھ سال تک جنرل سیکرٹری رہے۔ اور اسی سیاست کی وجہ سے حکومت کے ہاں معتوب رہے۔ اس وقت جمعیۃ علمائے اسلام کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔

صوفیانہ مسلک | آپ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہیں۔ انہی کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش فرماتے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ہر سال ختم بخاری کی تقریب میں دیوبند شرکت کرتے اور ساتھ ہی حضرت مدنیؒ سے روحانی فیض حاصل کرتے۔

★

جناب مصطفےٰ عباسی صاحب۔ ایم اے (مری)

علمائے حق اور پاکستان

- علماء کا سیاسی اقتدار پاکستان کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہوگا۔
- اختلاف مقاصد میں نہیں حصول مقاصد کے طریق کار میں تھا۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پاکستان مسلم لیگ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور علمائے حق ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلم لیگ میں نہیں تھے۔ بلکہ ان کی اکثریت مسلم لیگ کی مخالف تھی۔ لہذا یہ لوگ پاکستان کے مخالف تھے۔ بعض لوگ جان بوجھ کر عوام کو یہ غلط تاثر دے رہے ہیں۔ کہ جمعیت علماء اسلام کے زعماء نے آج بھی پاکستان کی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔ اور اب جبکہ صوبہ سرحد میں جمعیت اور نیپ نے مل کر صوبائی حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔ ملک دشمن اور انتشار پسند عناصر زور و شور سے پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ۔۔۔ یہ جماعتیں پاکستان کے وجود کی مخالف ہیں اور ان کا اقتدار پر قابض ہو جانا پورے ملک کی تباہی کا آغاز ہے۔ اس غلط اور سراسر لغو تاثر کو مٹانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ علمائے حق اور پاکستان کے تعلقات پر مدلل بحث کی جائے۔

دعویٰ | ہمارا دعویٰ ہے کہ علمائے حق نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان ہی کی مساعی جلیلہ اور جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان قائم ہوا ہے۔ یہ لوگ پاکستان کے مخالف نہیں بلکہ اس کے حامی اور محافظ ہیں۔ لہذا ان کا سیاسی اقتدار پاکستان کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ انشاءاللہ۔

ہمارا یہ دعویٰ محض علمائے حق سے عقیدت کی بنا پہ نہیں بلکہ اس کے لئے ہمارے پاس ٹھوس دلائل ہیں۔ اگر کتابوں رسالوں اور اخبارات سے بیانات کے اقتباسات نقل کرکے ہم اپنے دعوے کے لئے دلائل فراہم کریں تو یہ ایک طویل بحث بن جائے گی جس کی اس مختصر مقالے میں گنجائش نہیں۔

اس لئے ہم کوشش کریں گے کہ جو بات کہی جائے وہ اس ذمہ داری سے کہی جائے کہ اس کے نقلی دلائل نہ صرف یہ کہ ہم پیش کر سکیں۔ بلکہ قارئین کرام چاہیں تو ماضی قریب کے اخبارات و رسائل اور کتابوں سے خود بھی معلوم کر سکیں۔

تحریک آزادی پر کئی ایک کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مختلف رسالوں اور اخباروں میں بیشمار مضامین اور مقالات چھپ چکے ہیں۔ نیز ایسے افراد بھی بستی بستی قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں جو ۱۹۴۷ء میں سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ اور جو کچھ ہوا وہ ان کے سامنے کی بات ہے۔ یہ کتابیں مضامین مقالات اور لوگ ہمارے بیان کی یقیناً تصدیق کریں گے۔ ان سب کے علاوہ عالمی سطح پر تحریک ہائے آزادی کے عوامل و اسباب بھی ہمارے دعوے کی تائید کرتے ہیں۔ غرض ہم اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کریں گے، وہ امور مسلمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کے اثبات کے لئے نہ تو نقلی دلائل کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی گہری سوچ اور منطق کی حاجت ہے۔ سیدھی سادی باتیں ہیں۔ جن سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہوگا۔

علمائے حق ہمارے اس مقالے میں علمائے حق سے مراد وہ علماء کرام ہیں جنہوں نے خدا اور رسولؐ کے علاوہ کسی کی غلامی کو قبول نہیں کیا۔ یہ لوگ محض اصطلاحی قسم کی اسلامیات کے فاضل نہیں تھے بلکہ علوم دینیہ پر کامل دسترس کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست کے نشیب و فراز سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ پھر ان کا علم محض کتابوں تک محدود نہیں تھا، بلکہ عملی میدان میں بھی یہ دوسروں سے آگے تھے۔ جس طرح خالص مذہبی مسائل اور احکامات پر یہ لوگ عمل کرتے تھے اسی طرح اپنی سیاسی بصیرت پر بھی انہیں اعتماد تھا۔ اور جسے درست سمجھتے تھے۔ اس پر پورے خلوص سے عمل کرتے تھے۔

واضح اور کھلے لفظوں میں کہا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ علمائے حق سے مراد وہ لوگ تھے۔ جو ۱۹۴۷ء میں حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کی دیانت اور بصیرت پر اعتماد اور بھروسہ کئے ہوئے تھے۔ ہمارا دعوٰی ہے کہ ان لوگوں نے ہاں انہی لوگوں نے جن کے قائد ۱۹۴۷ء میں ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنیؒ تھے، پاکستان تسلیم کیا۔ اور یہی لوگ پاکستان کے حامی اور خیر خواہ ہیں۔ آپ ہمارے اس دعوے کی تردید میں جلدی نہ کریں۔ پوری بات کہہ لینے دیں۔ انشاء اللہ آپ کے شکوک و شبہات رفع ہو جائیں گے۔

پاکستان کیا ہے:؟ آپ کے شکوک و شبہات کی اساس اور بنیاد پاکستان کے اس غلط مفہوم پر ہے، جو عام طور پر پھیلایا گیا ہے۔ در اصل علمائے حق کے مخالفوں نے پاکستان کا ایک غلط مفہوم رائج کر دیا ہے۔ اور پھر کہنا شروع کر دیا ہے۔ علماء پاکستان کے مخالف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء حقیقی پاکستان کے مخالف نہیں تھے، بلکہ اس غلط مفہوم کے مخالف تھے جسے رواج دینے کی کوشش کی گئی ہے اور جس کی تغلیط حالات نے کر دی ہے۔ اور آج روز روشن کی طرح واضح ہو گیا ہے کہ پاکستان کا وہ مفہوم غلط تھا جس کی علمائے حق نے مخالفت کی تھی۔

اگر پاکستان سے مراد محض برصغیر کی تقسیم ہے۔ تو واقعی علماء اس کے مخالف تھے۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ محض تقسیم کا نام پاکستان نہیں بلکہ پاکستان سے مراد اس برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ان کی انفرادیت کی بقا اور ان کی اقتصادی خوشحالی ہے۔ یہ درست ہے کہ پاکستان نام کا دنیا میں یہی ایک ملک ہے جس میں آپ اور ہم بستے ہیں۔ لیکن مقصد اور مفہوم کے اعتبار سے دنیا کا ہر اسلامی ملک پاکستان ہے۔ سب سے پہلا پاکستان رسولِ خدا نے سرزمین عرب میں قائم کیا تھا۔ اور خلافت راشدہ کے عہد میں اسکی سرحدیں مشرق و مغرب میں دور دراز تک پھیل گئی تھیں۔

پاکستان محض تقسیم کا نام ہے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ حضرت عمرؓ جنہوں نے ایران، فلسطین، مصر، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں کو اسلامی سلطنت کی حدود میں شامل کیا تھا وہ ابتدائی اور دنیا میں سب سے پہلے قائم ہونے والے پاکستان کے مخالف تھے۔ سب جانتے ہیں کہ رسولِ خدا نے مدینہ منورہ میں ایک پاکستان قائم کیا تھا۔ یہ دنیا میں سب سے پہلا پاکستان تھا۔ اس میں مسلمانوں کا اقتدار ان کے مفادات ان کی انفرادیت اور اقتصادی خوشحالی سب کچھ محفوظ تھا۔ حضرت عمرؓ نے جو پاکستان قائم کیا تھا وہ تقسیم سے نہیں بلکہ اتحاد و اشتمال سے قائم کیا تھا۔

غرض پاکستان تقسیم سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے مفادات انفرادیت اور اقتصادی خوشحالی کے تحفظ سے قائم ہوا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ علمائے حق کا خیال تھا۔ کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے برصغیر کی تقسیم ضروری نہیں لیکن مسلم لیگ کے زعماء خیال کرتے تھے کہ ان مقاصد کے لئے تقسیم ضروری ہے۔ یہ اختلاف مقاصد میں نہیں بلکہ حصولِ مقاصد کے طریق کار میں تھا۔

علمائے حق کا خیال تھا کہ برصغیر کی تقسیم میں مسلمانوں کو نقصان ہو گا۔ وہ سمجھتے کہ یہ دنیا میں دوسرے نمبر پہ سب سے بڑا ملک مسلمانوں کی اکثریت کا ملک ہے۔ اکثریت اس طرح کہ ۱۹۴۷ء

میں یہاں چالیس کروڑ ہندو بستے تھے جن میں دس کروڑ مسلمان اور تیس کروڑ غیر مسلم ایک سو سے زیادہ مذہبوں اور ملتوں میں بٹے ہوئے تھے، اور کوئی ایک گروہ بھی ایسا نہ تھا جس کی آبادی قوت مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی۔ علمائے حق کو اسلام کی مقناطیسی قوت پر بھروسہ تھا، اور وہ یقین کرتے تھے کہ انگریز جو برّصغیر کی دوسری اقوام کو مسلمانوں کے اثرات سے بچائے ہوئے ہے۔ جب چلا جائے گا، تو مسلمانوں کے ساتھ میل جول اور اسلام کی عام اشاعت کے نتیجہ میں بیشتر اقوام مسلمان ہو جائیں گی۔

علمائے حق کا یہ خیال کہ انگریزوں کے جانے کے بعد برّصغیر کی بیشتر اقوام مسلمان ہو جائیں گی محض خوش فہمی نہ تھی بلکہ یہ ایک حقیقت تھی، ایک تاریخی اور واقعاتی حقیقت۔ اسلام میل جول سے پھیلا ہے۔ روز اوّل سے آج تک کی اسلامی تاریخ شاہد ہے۔ کہ اسلام کی اشاعت میں حسن معاشرت کا سب سے بڑا حصّہ ہے۔

اشاعت اسلام | علمائے حق کا خیال تھا کہ اگر برّصغیر تقسیم نہ ہو اور انگریز چلا جائے تو یہاں کی بیشتر اقوام مسلمان ہو جائیں گی۔ یہ خیال درست تھا۔ چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ :

"۱۸۵۳ء میں پورے بنگال میں ہندو مسلمانوں سے تقریباً ۵ لاکھ زیادہ تھے، اور بیس سال بعد ۱۸۷۲ء کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت میں نہ صرف مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر ہو گئی تھی، بلکہ مسلمان ۱۵ لاکھ زیادہ تھے"

آج بھی حالات بتا رہے ہیں کہ بھارت میں آباد مسلمانوں کے سوا کوئی ایک قوم بھی اپنے مذہب کی بقا اور تحفظ کے لئے زور نہیں دے رہی، محض روایتی قسم کے برائے نام مذہبی عقائد ہیں ورنہ عملاً پورا بھارت لادینی نظام کی گود میں جا چکا ہے۔ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ بھارت میں آباد غیر مسلم اقوام کے مذاہب بے جان ہیں، ان میں زندگی اور باقی رہنے کے خواص یا صلاحیت موجود نہیں۔

علمائے حق اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ جانتے تھے کہ انگریز جو اسلام کے اثرات کے پھیلنے میں واحد رکاوٹ بنا ہوا ہے، جب یہاں سے چلا جائے گا تو اقوام ہند جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو جائیں گی۔ اگر آج آزادی کے ۲۵ سال بعد بھارت کی اکثریت دھریت اور لادینیت کی گود میں جا چکی ہے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اس عرصے میں اسلام کی دعوت عام کی جاتی اور خاص کر اسلام کا اقتصادی، معاشی اور سیاسی پروگرام حکمت عملی کے ساتھ بھارتی اقوام کے سامنے پیش کیا جاتا تو یہ لوگ اسلام کی شعوری یا لاشعوری طور پہ قیادت قبول نہ کرتے ——

لاشعور کی بات چھوڑیئے، اس طرح تو روس اور چین نے بھی اسلام کی برتری کو تسلیم کرلیا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر علمائے حق کی تجویز کردہ حکمت عملی سے کام لیا جاتا تو بھارت کی بھاری اکثریت آج مسلمان ہوتی۔ بھارت میں اسلام کی اشاعت کے متعدد امکانات تھے۔ اور کسی حد تک اب بھی ہیں۔ ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اشارتاً عرض ہے :

۱۔ یہاں نیچ ذاتوں کے لوگوں کی اکثریت ہے، جنہیں اسلام کے سوا کسی مذہب میں عزت نہیں مل سکتی۔

۲۔ بھارت میں آباد کم و بیش تمام غیر مسلم اقوام کے مذاہب بدلتے ہوئے حالات کے باعث مٹ چکے ہیں۔ صرف نام یا چند رسمیں باقی ہیں۔

۳۔ اس برصغیر میں آباد مختلف اقوام کے مسائل گوناں گوں ہیں اور ان کا حل اسلام ہی میں ہے۔

بھارت اور مشرق بعید کے بیشتر ممالک میں یہی حالات تھے جن سے فائدہ اٹھا کر عیسائی مبلغوں نے گاؤں کے گاؤں عیسائی بنالئے ہیں۔ ہند چینی کے ممالک میں عیسائیت کی اشاعت کے واقعات ہمارے دعوے کی تصدیق کے لئے کافی ہیں۔

تحریک آزادی لوگ آزادی چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ آزادی کے بغیر معاشی خوشحالی حاصل نہیں ہوسکتی۔ غلام قوم ہمیشہ غربت و افلاس کا شکار بنی رہتی ہے۔ بھوک ننگ اور غربت اور افلاس سے نجات حاصل کرنے کیلئے لوگ آزادی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن علمائے حق کا نظریہ اس سے مختلف تھا۔ وہ دین کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے آزادی کے متوالے تھے۔ ان کی نظروں میں مادی خوشحالی کو چنداں وقعت نہ تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان اور غلام دو متضاد باتیں ہیں۔ ان کے ہاں حاکمیت صرف اور صرف خدائے ذوالجلال کو حاصل ہے۔ وہ کسی دوسرے کی حاکمیت کے سامنے جھک جانے کو شرک اور اسلام سے انحراف تصور کرتے ہیں۔ ان حالات میں علمائے حق کا آزادی کے لئے جدوجہد کرنا ان کا دینی فریضہ تھا۔ اور انہوں نے اس فریضہ کی ادائیگی کیلئے اسی جذبے اور خلوص سے کام کیا ہے۔ جس جذبے اور خلوص سے دین سے متعلق دوسرے کام کئے جاتے ہیں۔۔۔ علمائے حق آزادی چاہتے تھے تاکہ :

۱۔ اسلام کی اشاعت کا کام ہوسکے۔

۲۔ مسلمان ایک خدا کی اطاعت اور غلامی میں آجائیں۔

۴۔ خلق خدا اسلام کے سایۂ رحمت میں آرام پائے۔

اس کے برعکس دوسرے لوگ مادی مفادات کے حصول اور ان کے تحفظ کے لئے آزادی کی حمایت کر رہے تھے۔ ظاہر ہے جو شخص دین کے جذبے سے کوئی کام کرتا ہے، اس کا خلوص اس شخص کے خلوص سے بہر حال زیادہ ہوتا ہے۔ جو محض دنیاوی مفاد کے لئے کوشش کرتا ہے ـــــ

تحریک آزادی میں علماء نے دین کے جذبے سے کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام آزادی پسند علماء کی جدوجہد آزادی کی قدر کرتے تھے۔ اور باوجود عقائد کی مخالفت کے وہ انہیں میں آزادی کا قائد تصور کرتے تھے۔ نہرو اور گاندھی کو ابوالکلام آزاد کے عقائد سے اختلاف تھا۔ لیکن آزادی کی جنگ میں پٹیل وغیرہ کے مقابلے میں ان کی قیادت اور خلوص پر زیادہ اعتماد تھا۔ وہ جانتے تھے کہ آزاد جس جذبے سے کام کر رہا ہے اس میں دھوکہ اور فریب نہیں۔ یہ پرخلوص جذبہ ہے۔

علمائے حق نے آزادی کی تحریک میں نہ صرف کام کیا بلکہ اس تحریک کے بانی اور محرک بھی یہ لوگ تھے۔ ان لوگوں نے ہی اس تحریک کا آغاز کیا۔ اور آہستہ آہستہ مسلمانوں اور دوسری اقوام کو اپنے ساتھ ملایا۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ برصغیر سے انگریزوں کا انخلاء یہاں پر آباد مختلف اقوام کے اتحاد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ علماء نے اس اتحاد کی دعوت دی اور اس میں کامیاب ہوئے۔ جب آزادی کی گھڑی قریب آئی تو لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ آزادی کے بعد کیا ہوگا۔ علمائے حق کا خیال تھا کہ یہ وقت مستقبل کے بارے میں منصوبے بنانے کا نہیں بلکہ آزادی کی لڑائی لڑنے کا ہے۔ اور جب یہ لڑائی کامیابی سے ختم ہو جائے گی۔ اس وقت حالات کے پیش نظر جو کچھ مناسب ہوگا۔ اقدام کیا جائے گا۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ جو لوگ آزادی کے لئے لڑی جانے والی جنگ کے دوران میں یہ فکر لیکر بیٹھ گئے تھے کہ آزادی کے بعد کیا ہوگا۔ وہ مخلص نہ تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ عمل حکمت عملی کے خلاف اور حصول آزادی کی جنگ میں ناکامی کا باعث ہو سکتا تھا۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہمارے دو دشمن تھے اور اگر انگریز چلا جاتا تو ہمارا صرف ایک دشمن رہ جاتا جس سے لڑائی اور جنگ کی صورت میں جیت بہر حال ہماری ہوتی۔

دو قومیں | جس طرح ہمارے بہت سے شکوک و شبہات کی بنیاد پاکستان کا غلط مفہوم

ہے۔ اس طرح دو قومی نظریہ بھی واضح نہ ہونے کے باعث ہمارے لئے ذہنی الجھن کا باعث بنا ہوا ہے۔

کہا جاتا تھا۔ اور اب بھی کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے برصغیر میں دو قومیں آباد تھیں مسلمان اور ہندو۔ حالانکہ یہاں دو قومیں نہیں کم و بیش تین صد قومیں آباد تھیں۔ اور ہم نے خواہ مخواہ بغیر کسی ضرورت اور مجبوری کے مسلمانوں کے علاوہ باقی تمام قوموں کو ایک قوم تصور کر لیا۔ اس سے ہم میں ایک طرف تو یہ احساس پیدا ہوا کہ ہم اقلیت میں ہیں۔ اور دوسری طرف بھارت کی متحدہ قومیت کا تصور مضبوط ہو گیا۔

فرض کریں آج سکھ اپنی آزادی کیلئے جدوجہد کرتے ہیں تو ہم ان کی مدد نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ۱۹۴۷ء میں ہم نے "برصغیر میں صرف دو قومیں آباد ہیں" کا نعرہ لگا کر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ سکھ کوئی الگ قوم نہیں بلکہ ہندو قومیت کا ایک حصہ ہیں۔ اور جب سکھ الگ قوم نہیں تو ان کا آزادی کا مطالبہ ایسا ہی بے معنی اور لغو ہے، جس طرح پاکستان کے کسی صوبے کے عوام پاکستان سے علیحدگی اور آزادی کا مطالبہ کریں تو یہ بے معنی اور لغو ہوگا۔ ایک ملک میں ایک قوم بستی ہے۔ اور ایک قوم کا ایک ملک ہوتا ہے۔ اگر پاکستان ایک ملک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں صرف ایک قوم بستی ہے۔ اور اگر بھارت میں ایک قوم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت ایک ملک ہے۔ اور جب بھارت ایک ملک ہے تو ہمیں از روئے اخلاق بھارت کی وحدت کو نقصان پہنچانے والے کسی مطالبے کی حمایت کا حق حاصل نہیں، جس طرح ہم کہتے ہیں، ہم کیا ساری دنیا کہتی ہے کہ بھارت کو پاکستان کی وحدت کے خلاف بنگلہ دیش کے مطالبے کی حمایت کا حق حاصل نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ نے ۱۹۴۷ء سے چند سال پہلے بڑے زور دار دلائل سے یہ اعلان کیا تھا کہ قومیں اوطان سے نہیں بلکہ مذاہب سے بنتی ہیں یعنی ایک سیاسی وحدت یا ایک ملک میں بسنے والے ایک قوم نہیں ہوا کرتے بلکہ ایک مذہب کو ماننے والے ایک قوم ہوا کرتے ہیں۔

اور تاریخ اور جغرافیہ کا ایک مبتدی بھی یہ جانتا ہے کہ برصغیر میں صرف اسلام اور ہندومت دو مذہب رائج نہیں تھے۔ یہاں تین سو کے قریب مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ آباد تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ برصغیر میں صرف دو قومیں آباد تھیں، حقائق سے اغماض کی بدترین مثال ہے۔

آزادی اور پاکستان | پاکستان کا ایک وہ تصور ہے، جو اوپر پیش کیا گیا ہے یعنی مسلمانوں

کے مفادات انفرادیت اور اقتصادی خوشحالی کی حفاظت اس کے علاوہ یہ بھی پاکستان ہے جس میں ہم آباد ہیں۔ یہ مسلمانوں کی آزاد مملکت ہے۔ یہاں کے عوام اقتدار کے مالک ہیں ان پر کوئی غیر ملکی طاقت حکمران نہیں۔ اس مملکت کا قیام محض برصغیر کی تقسیم سے وجود میں نہیں آیا بلکہ حصول آزادی کی جدوجہد میں کامیابی سے یہ ملک قائم ہوا ہے۔ اگر ملک آزاد نہ ہوتا اور انگریزی راج اور یونین جیک کا سایہ سروں پر ہوتا تو پاکستان کا نام اور تصور بھی نہ ہوتا۔ یہ جو کچھ ہے آزادی کے صدقے میں ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ آزادی کی جنگ علمائے حق نے لڑی ہے۔ جنگ میں مقابلہ ہوتا ہے۔ قتل و غارت کی نوبت آتی ہے۔ اور ایک بار نہیں بار بار شکست اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور جب شکست ہوتی ہے تو جیتنے والی طاقت شکست خوردہ فوج سے انتقام لیا کرتی ہے۔

یہ سب مراحل علمائے حق نے طے کئے ہیں مجھے معاف فرمائیں میں تاریخ کے واقعات پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ اور مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ پاکستان کے قائم کرنے اور اس کی حفاظت کے دعوے کرنے والے مسلم لیگی لیڈروں نے آزادی کے حصول کے لئے اس جرأت، ہمت اور شجاعت سے جنگ نہیں لڑی جس جرأت، ہمت اور شجاعت کا علمائے حق نے مظاہرہ کیا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو مسلمانوں کے دشمن (انگریز) کی حمایت میں تھے، بہت سے پاکستان کے نام لیوا انگریزوں کے تنخواہ دار ملازم تھے۔

عجب بات یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنیؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرھم کو تو مسلمانوں کے مفاد کا دشمن کہا جائے۔ اور غلام محمد، سکندر مرزا، ایوب خان اور یحییٰ خان کو مسلمانوں کے مفادات کا محافظ اور پاکستان کا حامی اور خیرخواہ مانا جائے۔

میاں افتخار الدین (سابق مسلم لیگی لیڈر) نے نومبر ۱۹۵۲ء میں پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"خان عبدالغفار خان جو آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں پندرہ سال تک انگریزوں کی قید میں رہا اور مصائب برداشت کرتا رہا ہے وہ مشتاق احمد گورمانی سے زیادہ قابلِ اعتبار اور لائقِ ستائش ہے۔ جو پندرہ سال تک برطانوی استعمار کا خدمت گذار اور وفادار ملازم رہا ہے۔"

غرض پاکستان کا قیام آزادی کا نتیجہ ہے۔ اور آزادی کے لئے سب سے زیادہ جدوجہد علمائے حق نے کی ہے۔ اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان علمائے حق کی کوششوں سے قائم ہوا ہے۔۔۔۔ نیز۔۔۔۔ پاکستان کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں کی انفرادیت کا مسلمانوں کی تہذیب مسلمانوں کی ثقافت اور مذہبی اقتدار کا اور یہ سب چیزیں علمائے حق کے دم قدم سے باقی ہیں۔

مسلمانوں کی انفرادیت کا نعرہ لگانے والے مسلم لیگی لیڈر کل کی طرح آج بھی مغربی تہذیب میں گم ہیں۔ ان کے چہرے مہرے شکل وصورت، بول چال، رنگ ڈھنگ اور معاشرت کے اداب ورسوم میں اسلامی انفرادیت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

غور فرمائیں کہ اردو کے نام پر پاکستان کی تحریک چلانے والوں نے پورے پچیس سال تک اردو کی مخالفت اور انگریزی کی سرپرستی کی ہے۔ اور جنہیں ہندو نواز اور مسلمانوں کی انفرادیت کا مخالف کہا جاتا تھا۔ خدا نے انہیں توفیق دی ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس میراث کی حفاظت کریں چنانچہ آج بلوچستان کی سرکاری زبان اردو ہے۔

گائے کی قربانی کو بہانہ بنا کر ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑکانے والے پچیس سال تک شراب کی سرپرستی کرتے آئے ہیں۔ اور خدا نے مسجد کے ایک مولوی ہاں اسی مولوی کو جسے مسلم لیگ نے مسلمانوں کا غدار اسلام کی انفرادی اقتدار کا منکر' اور بے بصیرت ملّا کہا تھا، یہ سعادت بخشی ہے کہ اس نے پورے صوبہ سرحد میں شراب پر پابندی لگا دی ہے۔

خان عبدالولی خان کے اس طنز کا کسی کے پاس کیا جواب ہے۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ:
"میں نے آج تک انگریزی لباس نہیں پہنا"

مختصر یہ کہ مسلم لیگ کے مقابلے میں علمائے حق اور ان کے رفقاء کار نے مسلمانوں کے مفادات ان کی انفرادیت اور اسلامی اقتدار کی بہتر طور پر خدمت کی ہے۔ اور یہی وہ عوامل اور محرکات ہیں جنکی بدولت پاکستان وجود میں آیا اور آج تک قائم ہے۔

تقسیم کی مخالفت | اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ علمائے حق نے برصغیر کی تقسیم کی مخالفت کیوں کی تھی۔۔۔؟ اس کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے۔ کہ علمائے حق چاہتے تھے کہ ملک کو تقسیم نہ کیا جائے بلکہ یہاں کی اقوام کو مسلمان بنایا جائے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ان کے سامنے تھی کہ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں نہیں ہیں، اقلیت میں تب ہو سکتے ہیں جب مسلمانوں کے علاوہ باقی تمام مذاہب کے لوگ ایک مذہب قبول کر لیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ صورت نہ تو ممکن تھی اور نہ ہی

اب ممکن ہے۔ ۱۹۴۷ء میں برصغیر میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد یہ تھی :

مسلمان	۱۰ کروڑ
مہاسبھائی ہندو	۶ کروڑ
آریہ سماج	۴ کروڑ
اچھوت	۶ کروڑ
بدھ اور جین وغیرہ	۶ کروڑ
عیسائی یہودی وغیرہ	۲ کروڑ
سکھ اور دوسری اقلیتیں	۶ کروڑ

یہ اعداد و شمار قطعی تو نہیں لیکن کم و بیش حقیقت کا آئینہ ضرور ہیں۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں نہیں تھے اور یہ فرض کر لینا کہ یہاں صرف دو مذہبوں کے ماننے والے لوگ تھے۔ یعنی مسلمان اور ہندو قطعاً غلط ہے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مسلمانوں کے علاوہ باقی تمام لوگ متحد ہو کر مسلمانوں کے مقابلے میں ایک قوم مان لیا جائے تو بھی تقسیم میں مسلمانوں کا فائدہ نہ تھا۔ اس لئے کہ اس صورت میں مسلمان تین جگہ بٹ جاتے۔ مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان اور بھارت تین الگ الگ جغرافیائی وحدتیں ہیں۔ اور ان تین وحدتوں میں مسلمان اس طرح تقسیم ہو جاتے ہیں۔ کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں چھ کروڑ مسلمان اور چار کروڑ ہندو اور ظاہر ہے کہ چار کے مقابلے میں چھ کی تعداد گو اکثریت کی تعداد ہے۔ لیکن ایسی اکثریت نہیں کہ اقلیت کو مناسب طور پر قابو میں رکھ سکے۔

چھ کروڑ مسلمانوں کے ملک میں چار کروڑ ہندو بغاوت کر دیں تو مسلمانوں کے لئے اس بغاوت کا کچلنا آسان نہیں تھا۔ دوسری طرف بھارت میں چار کروڑ مسلمان اور چھبیس کروڑ ہندو ہوتے اور وہاں ان کی انفرادیت کو زبردست خطرہ ہوتا۔

یہ خدا کا فضل ہوا کہ آبادی کا تبادلہ ہو گیا گو اس تبادلے کے نتیجے میں ہمیں نصف بنگال اور نصف پنجاب بھارت کو دینا پڑ گیا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو مشرقی پاکستان میں آج چار کروڑ ہندو اور مغربی پاکستان میں تین کروڑ ہندو اور سکھ ہوتے۔

علمائے حق ان خطرات سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لئے وہ کہتے تھے کہ تقسیم میں مسلمانوں کا نقصان ہے۔ ان کا یہ خیال تو درست ثابت ہو چکا ہے۔ کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان

کو ایک سیاسی وحدت میں رکھنا مشکل ہوگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی آخری کتاب ـــــ
"انڈیا ونز فریڈم" میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ پاکستان کی حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا،
کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو جن میں سوائے اسلام کے کوئی قدر مشترک نہیں ایک سیاسی وحدت
میں قائم رکھ سکے۔ اسلام اتحاد کا ذریعہ ضرور ہے لیکن دوسرے امور بھی کم حیثیت نہیں رکھتے آج افغانستان
ہمارا ہمسایہ اسلامی ملک ہے اسلام کی مشترک اقدار کے باوجود پاکستان اور افغانستان میں اختلاف ہے۔ افغانستان
کے لوگ پاکستان کی سیاسی برتری کو ماننے کے لئے تیار نہیں اور ہم انہیں پختونستان کا نام لینے
کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ علمائے حق اور خاص کر مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ خیال بالکل بجا اور
درست ثابت ہوا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا اتحاد دیرپا ثابت نہیں ہوگا۔ عقائد بہرحال
کچھ بھی ہوں اور ان میں کتنی ہی قوت کیوں نہ ہو لیکن جغرافیائی اور اقتصادی امور اپنے اثرات ظاہر
کر ہی دیتے ہیں۔ (البتہ عقائد اور نظریات کو عملی زندگی پر لاگو کرنے سے ایسے امور کو ردِ عمل کا موقع ہی نہیں ملتا اور اسلام کا
رشتہ اٹوٹ رہتا ہے۔ ایڈیٹر)
خلاصہ یہ کہ علمائے حق نے برصغیر کی تقسیم کی اس لئے مخالفت کی تھی کہ ان کے خیال کے
مطابق یہ تقسیم مسلمانوں کے مفادات کے خلاف تھی لیکن جب مسلمانوں نے تقسیم قبول کر لی تو
علمائے حق نے اکثریت کے اس فیصلے کی مخالفت نہیں کی۔ جمہوری اقدار کا تقاضا تھا کہ جب
اکثریت نے ایک فیصلہ کر دیا ہے تو اسے مان لیا جائے۔ اس طرح قیام پاکستان کے بعد علمائے
حق نے اسکی بقاء، تحفظ اور سالمیت کے لئے رات دن کام کیا ہے۔ پاکستان کے خلاف بہت
سے لوگوں نے سازشیں کیں۔ بھارت کو اطلاعات پہنچائیں۔ مغربی ممالک سے روابط قائم کئے۔
امریکہ اور دوسرے سامراجی ممالک سے ملکر ملک کی اقتصادی خوشحالی کو ناقابلِ تلافی نقصانات
پہنچائے ہیں اور نئی نسل کو ایک ایسے چوراہے پر لے آئے ہیں جہاں مایوسیوں کا اندھیرا ہی اندھیرا
ہے۔ ان لوگوں میں مختلف چہرے اور شخصیتیں نمایاں ہیں۔ لیکن علمائے حق اور ان کے رفقاء کار
میں سے کوئی ایک بھی نہیں جس کا نام ان غداروں کی فہرست میں ہو۔

پچیس سال میں جو کچھ ہوا اس میں علمائے حق کا رائی برابر قصور نہیں یہ فصل ان مسلم لیگیوں کی
بوئی ہوئی ہے جو علمائے حق کو غدار اور اپنے آپ کو محافظِ ملت کہا کرتے تھے۔ گویا علمائے حق
کی کوششوں سے پاکستان قائم ہوا۔ اور مسلم لیگیوں کی خرمستیوں کے نتیجے میں اسے نقصان پہنچا ہے

قسط ۴

مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیری

عظیم اسلامی مملکت کی بربادی کی ذمہ دار

شراب
اسلام کی نظر میں

اے! صدر محترم ایک نظر اس پر بھی۔ (ایڈیٹر)

بلجیم ایسے چھوٹے ملک میں جسکی آمدنی کے ذرائع و وسائل بھی یقیناً محدود ہی ہوں گے دولت کی ایک اتنی بڑی مقدار اس پانی کے حاصل کرنے کے لئے صرف کر دی جاتی ہے جو اپنے مزاج اور اثرات کے اعتبار سے آتش سیال ہے۔ اور یہ اعداد و شمار تو ایک ایسی کتاب سے نقل کئے جا رہے ہیں۔ جو تقریباً آج سے دس سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۶ء کے ان اعداد و شمار پر غور کیجئے جو تہذیب کے ایک بڑے مرکز لندن سے شائع ہوئے ہیں کہ :

"بیئر انگریز کا قومی مشروب ہے، اور وہ اسے شراب نہیں بلکہ پانی سمجھ کر پیتا ہے۔ بیئر کے علاوہ وسکی، برانڈی، جن، رم، وائن اور شمپین کی بھی خوب کھپت ہے۔ پچھلے سال انگریزوں نے اسی لاکھ وسکی کی بوتلیں چڑھائیں جن کی انہیں مبلغ ایک ارب ۳۶ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ قیمت ادا کرنا پڑی۔ اسی سال جن کی ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ بوتلیں استعمال ہوئیں، جو زیادہ تر عورتوں میں مقبول ہے۔ رم بھی یہاں کی عورتوں کی محبوب شراب ہے، جس کی اس سال ایک کروڑ ۲۰ لاکھ بوتلیں کھل گئیں۔ "نیشنل ڈرنک" بیئر سے عورتیں نفرت کرتی ہیں مگر مرد اسے بخوشی استعمال کرتے ہیں۔ اور آج ۱۷ گیلن سالانہ فی کس اس کا استعمال ہے۔ (انسانیت حیوانیت کی راہ پر صہ ۲۴۲)

یورپ کے مرکزی شہروں کی ان تفصیلات کے بعد ہند و پاکستان کے بھی اعداد و شمار دیکھئے ایک خبر ہے کہ :

"دہلی میں ہر سال شراب نوشی، سینما بینی میں اضافہ ہوتا ہی چلا جا رہا ہے۔ ۶۶ء

میں دہلی کے شہریوں کے لئے تین لاکھ ۵۶ ہزار ۱۴۰ گیلن، یعنی ۲۱ لاکھ ۳۶ ہزار ۸۴۰ بوتلیں شراب کی خرچ ہوئیں اس میں ۳۵۵ ۱۱ گیلن ٹھرا اور باقی ولایتی شراب تھی۔" (ایضاً ص۲۵)

پاکستان کے صرف ایک صوبۂ پنجاب کے متعلق اطلاع ہے کہ:

"صوبۂ پنجاب میں دس ہزار سے اوپر اشخاص کے پاس شراب کے پرمٹ موجود ہیں"

ان اعداد و شمار پر جو معتبر اور ثقہ ذرائع سے ہم تک پہنچ رہے ہیں۔ سوچئے کہ ملک کی دولت کا ایک بہت بڑا حصہ کس غلط راہ میں صرف ہو رہا ہے۔ دولت کا یہی گرانقدر حصہ اگر ملک کی دوسری فلاحی اسکیموں پر خرچ کیا جاتا تو خوشحالی اور ملکی بہبودی و فلاح، خود ملک کے لئے اور وہاں کے باشندوں کے لئے کس قدر مفید ہوتی۔ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ فاقوں اور بھوک کے پیچ و تاب میں مبتلا ہے۔ اور ان پر افلاس و فلاکت کا دیو اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک طبقہ اور بڑا طبقہ عیاشی اور تعیش کے اس تباہ کن مشغلہ میں مبتلا ہے۔

شاید یہاں یہ کہا سکے کہ شراب سے محصول، ٹیکس وغیرہ کی صورت میں آمدنی کا ایک بڑا حصہ حکومتِ وقت تک پہنچ جاتا ہے۔ جس سے وہ ملکی خوشحالی کا توازن باقی رکھ سکتی ہے۔ اگرچہ یہ شبہ میرے مقصد سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا اس لئے کہ کہا تو یہ جا رہا تھا کہ انفرادی طور پر اگر حکومت سے قطع نظر کرکے اجتماعی زندگی اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے ان پر دولت صرف کی جاتی تو بھوکے اور ننگے عوام حکومت سے بے نیاز ہو کر بھی اپنے بھائیوں کی جیب سے اپنی تباہ حالی کا علاج کر سکتے تھے تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے آبکاری کے محکموں سے وصول ہونے والی دولت جو حکومت کو پہنچتی ہے۔ اس کا اعتبار کر لیا جائے تو جاننے والے جانتے ہیں کہ شراب نوشی کے نتیجہ میں جرائم کی تعداد میں جو غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ اسکی روک تھام کے لئے حکومتوں کو اس آمدنی سے زیادہ صرف کرنا پڑتا ہے جو آبکاری کے محکموں سے حاصل ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر رابرٹ پرسن نے لکھا ہے کہ:

"شراب سے محصول، ٹیکس وغیرہ کی صورت میں سرکاری آمدنی ایک باطل و پُر فریب تصور ہے بلکہ یہ آمدنی تو عوام کی جیب پر قانونی ڈاکہ زنی کے مترادف ہے۔ امریکہ میں اس سے معقول آمدنی ضرور خزانہ سرکاری میں داخل ہوتی ہے۔ لیکن اس سے بیس گنا خرچ بھی تو مجرموں کی گرفتاری اور جرائم کی روک تھام پر ہوتا ہے۔" (انسانیت حیوانیت کی راہ پر ص۲۲۴)

ڈاکٹر رابرٹ پرسن کی اس رپورٹ پر میکشی کرنے والوں اور خود حکومتوں کو غور کرنا چاہئے کہ عوام اپنی دولت کو لٹا رہے ہیں۔ اور حکومت بھی محصول و ٹیکس لیکر اس سے بیس گنا زائد انسداد جرائم کے لئے

خرچ کر کے عقل و دانش کا ثبوت نہیں دے رہی ہے۔ قرآن کریم نے شراب نوشی کا ایک نقصان بغض و عداوت پیدا کرنا بتایا ہے۔

بغض و عداوت | ظاہر ہے کہ اس مضرت عظیم کا بھی تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ یہ شقاق و نفاق آویزش و جھڑپ معاشرہ اور اجتماعی زندگی کے لئے وہ خطرناک طاعون ہے، جس سے سوسائٹی کی اجتماعیت دیکھتی ختم ہو کر رہ جاتی ہے، اور اسلام باہمی طور پر جو اتحاد و ایتلاف پیدا کرنا چاہتا تھا، اس کے خلاف نتائج سامنے آتے ہیں۔ اور کم از کم اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بادہ پرستوں کو شراب سے اجتناب کرنے والوں کے ساتھ اور پرہیز کرنے والوں کو بلانوشوں کے ساتھ فطرت سلیمہ کے تقاضوں کے مطابق یا گندی ذہنیت کے محرکات کے تحت ایک بغض و عداوت یقینی اور حتمی ہے۔ شاید بغض و عداوت کی یہی صورت قرآن کے پیش نظر ہو۔

انسداد مے نوشی کی ضرورت | جسمانی، اخلاقی، عائلی اور معاشرہ کی تباہی جو شراب نوشی کا بدیہی نتیجہ ہے، اس کی مختصر تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ

شراب کے خطرناک عواقب و نتائج کے پیشِ نظر بہت ضروری ہے کہ مے کشی کے سلسلے کو جلد از جلد بند کیا جائے۔ بنی نوع انسان کے لئے یہ وہ زبردست خطرہ ہے جس کے مہلک خطرات کو امریکہ اور یورپ کے مصلح بھی آج تسلیم کر رہے ہیں۔ جیسا کہ مصنف نے اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "یورپ و امریکہ کے مصلحین شراب کے مضر نتائج کو اس دور میں بنی نوع انسان کے لئے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے ہیں۔" (الخمر والحیوٰۃ صفحہ ۱۱۰)

اور دنیا کے جن حصوں میں شراب نوشی کو قانوناً بند کر دیا گیا، وہاں کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہلاکت سے قریب ہونے والی انسانیت جامِ زہر کے ان تلخ گھونٹوں سے بچکر ایک مرتبہ پھر زندگی اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ یوپی کے وزیر آبکاری نے اپنی تقریر ۲۲ر مارچ ۱۹۵۴ء میں کہا تھا کہ:

> "جن ضلعوں میں نشہ بندی کا قانون نافذ ہو گیا ہے۔ وہاں کے دیہی علاقوں کی معاشرتی حالت پہلے سے کہیں بہتر ہو گئی۔ ایک تحقیقاتی پروگرام کے ذریعہ سے جو اعداد جمع کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ ممنوع علاقوں میں جرائم فوجداری کی تعداد میں ۷۰ فیصدی کمی ہو گئی ہے۔ خانگی زندگیاں سدھر گئی ہیں، اور ان علاقوں میں رہنے والوں

کی ترمیدار ہی بھی کافی گھٹ گئی ہے۔" (صدق جدید ۱۹ اپریل ۱۹۵۴ء)

اسلام کا دنیائے انسانیت پر احسان عظیم | "منافع للناس" سے بات شروع ہوئی تھی۔ شراب ایسے زہر ہلاہل میں منافع ڈھونڈھنے والوں کے واہی خیالات کی تردید میں مقالہ نگار کو یہ صفحات سیاہ کرنے پڑے۔ شراب کے مضار و نقصانات کو اعداد و شمار کی روشنی میں تفصیلات سے پیش کرنے کے بعد کیا مقالہ نگار دریافت کر سکتا ہے کہ وہی جام زہر جو جسمانی صحت، اجتماعی اور عائلی زندگی کے لئے تباہ کن ہے جس سے زندگی کے تمام ہی گوشے متاثر ہوتے ہیں۔ اور جو اپنے تباہ کن اثرات کو انسانیت کے جسم پر زخموں کی صورت میں پھوڑ جاتا ہے۔ کیا اس کی ان خطرناک و مہلک مضرتوں کے بالمقابل چند حقیر و غیر ضروری منفعتوں کو حاصل کرنے کے لئے انسان انسان رہتے ہوئے استعمال کرنے کے لئے خود کو آمادہ کر سکتا ہے۔ میں تو نہیں سمجھ سکتا کہ اس انسان اور حیوان لایعقل میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ جو اپنے نفع و نقصان کو محسوس نہ کر سکے اور دانستہ موت کے جانگسل دیو کو اپنے اوپر مسلط کرے۔ پس بلاشبہ انسانیت پر اسلام کے ہزارہا احسانات کے ساتھ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ کتنا بڑا اور جامع احسان ہے کہ اس نے آج سے چودہ سو سال قبل تحریم شراب کے مسئلے کو دوٹوک طریقہ پر سمجھا کر اس زہر ہلاہل کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کی بلیغ کوشش کی تھی اور بلا تخصیص مذہب و ملت اس کی ہولناک مضرتوں سے انسانیت کو مطلع کیا تھا۔ لیکن آج اقتدار طلبی کا بھوکا یورپ سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر، معاشی اور اقتصادی تفوق کے پیش نظر مسلمانوں کی قوت عمل کو چھین لینے کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ عالم اسلامی کو اس پر کیف مشروب میں زہر کے اجزاء تحلیل کر کے پلا دے۔ اور اس طرح دنیا کی امامت بلا شرکت غیرے اس کو حاصل ہو۔ چنانچہ ترکی اور قاہرہ میں شراب نوشی کی کثرت جس کی اطلاع دیتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:

> "موجودہ سیاسی حالات کی غلط تشریح کے باعث اور نقل سے عیسائی حکمرانوں کی برابری حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں میں بھی شراب خواری عام ہو رہی ہے، اور اس شان سے کہ پیرس، لندن اور برلن سے کہیں زیادہ شراب کے اشتہار قاہرہ[1] میں نظر آتے ہیں۔
> شمالی الجیریا کے مہذب الجیریائی اور مشرق قریب کے ترقی یافتہ مسلمان شراب خوار ہیں۔

---

[1] مصر کے ایک نو وارد دوست نے بتایا کہ قاہرہ میں ہر دس دکان کے بعد ایک شراب کی دکان ضروری ہے۔ مے کشی کی انتہا یہ ہے کہ ہوٹلوں میں ایک میز پر کھانے والے کے ساتھ متصلاً بیٹھا ہوا مسلمان شراب پیتا ہوا ملے گا۔

جب میں انگورہ کا شہر دیکھ چکا تو میں نے ایک ترک سے پوچھا کہ کیا اور قابل دید جگہ انگورہ میں باقی رہ گئی ہے تو اس نے مجھ سے پوچھا کیا تم نے ہمارا سب سے بڑا شراب خانہ دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ حکومت ترکی نے سات شراب خانے ترکی میں کھول رکھے ہیں۔ اور ترکی ریڈیو پہ گا ہے گا ہے شراب کی صفات ترکوں کو سمجھائی جاتی ہیں کہ یہ رنگ لال کرتی ہے۔ گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمی پہنچاتی ہے۔ تمام مہذب اقوام شراب پیتی ہیں۔ ترک بھی اب یورپین ہو گئے ہیں"

(اسلامی روایات کا تحفظ ص۱۲۶)

بتاتی ہے کہ یورپ کا وہ زہر آلود خنجر جس سے مسلمانوں کو ذبح کرنے کا مشورہ چالاک اور گھاگ مدبروں نے دیا تھا۔ ٹرکی اور قاہرہ کے مسلمانوں پر چل گیا ہے۔ مسلمانوں کی ان دو بڑی سلطنوں کے مسلمان باشندوں کی یہ بلانوشی۔؟ اس موقع پر مجھ کو بے اختیار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے وہ الفاظ یاد آ رہے ہیں، جو آپ نے تحریم خمر کا حکم آجانے کے بعد فرمائے تھے کہ :

"اگر شراب کا ایک قطرہ کسی کنوئیں میں گر جائے، پھر اس سے منارہ بنا کر مجھ کو اذان کے لئے بلایا جائے تو ہرگز اذان نہ دوں گا۔ اور اگر قطرۂ شراب سمندر میں جا پڑے، اور خشک ہو جانے کے بعد وہاں سبزہ اگ آئے تو میں اپنے جانوروں کو چرانے کے لئے قطعاً آمادہ نہیں۔" (روح المعانی ص۱۱۲)

لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں وہ بھی ہوں گے جو اسی حرام مشروب میں لذت سرور، نشاط و کیف کی تلاش کریں گے۔ اس کی کیا خبر تھی۔ درد و کرب سے کراہتی ہوئی انسانیت کے مرہم و مداوا کا کام جن کے سپرد کیا گیا تھا، زہر آلود نشتروں سے آج انہیں کا جسم گھائل ہے۔ یورپ بھی جانتا تھا کہ اسلام ہی اس وار کو کامیاب ہونے میں مزاحم بنا ہوا ہے۔ لہذا اس نے بھی فراست و دانائی سے کام لیتے ہوئے اسلام ہی کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا۔ اب راہ صاف ہے اور مسلمانوں کی رگ حیات کو کاٹنے کا موقع حاصل ہے۔ وہی ہنری فرانسیسی جس نے یورپ کو مشورہ دیا تھا کہ مسلمانوں کو ذبح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شراب کا رواج عام کیا جائے۔ اپنی کتاب خواطر و سوانح فی الاسلام میں لکھتا ہے کہ :

"ہم نے یہ ہتھیار الجزائر کے مسلمانوں پر استعمال کیا۔ لیکن ان کی شریعت اسلامیہ نے روک دیا کہ وہ اس کو استعمال کریں۔ لہذا ان کی نسل برابر بڑھ رہی ہے۔ کاش! یہ مسلمان اگر ہماری اس تلوار کو اسی طرح چلنے دیتے جس طرح کہ انہیں میں کے منافقین نے اپنی

گردن کٹوانے کے لئے پیش کر دی تو یقیناً یہ سب ہمیشہ کے لئے بزرگوں کہہ دئے جاتے ۔ (طنطاوی ص ۱۹۵)

لیکن ٹرکی و قاہرہ میں اسی اسلام کی گرفت جب ڈھیلی پڑی تو مسلمانوں کا بہک جانا مستعد نہ رہا۔ ہنری فرانسیسی کو کیا اس کا احساس نہیں کہ اس زہر آلود خنجر سے خود بھی وہ غیر شعوری طور پر ذبح ہو رہے ہیں، اور یورپ کے گوشہ گوشہ سے کراہتی ہوئی انسانیت کی آہ و پکار ہر گھڑی سنی جا سکتی ہے۔ یورپ اگر مسلمانوں کا قتل عام کرنے کی تجاویز و منصوبوں پر اپنی دماغی طاقت صرف کرنے کے بجائے دنیا کو اسلام کے حیات آفریں اور سکون بخش اصول پر کاربند ہونے کی دعوت دے تو انسانیت کو ہلاکتوں سے محفوظ رکھنے کا یہ عظیم الشان اقدام ہوگا جس کے ثمرات سے خود یورپ بھی جائز طور پر نفع اٹھا سکے گا۔ لیکن یورپ آج تک نہ سمجھ سکا کہ اسلام کو ضعیف و مضمحل کرنے سے انسانیت کس طرح تباہی کے گڑھوں میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کا تنزل انسانیت کے قلعے کے لئے ڈائنامیٹ کا حکم رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر آج نہیں تو کل پوری دنیا کو تسلیم کرنا پڑیگا۔

بقیہ: یہودی سازش ـــــ نہ صرف بٹ گیا بلکہ ہندوؤں کے ہاتھوں ایسی شکست ہوئی جسکی مثال شاید ہی دنیا کی تاریخ میں ملے۔ پاکستانی سیاست داں، ارباب حل و عقد اور عوام اس سانحہ عظیم سے بھی سبق لے لیتے تو امید تھی کہ کھویا ہوا وقار شاید پھر حاصل ہو جاتا لیکن نہ تو اس شکست کے بعد سیاست دانوں کے رویہ میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی اور نہ ہی عوام میں، عوام کسی مرنے والے کے پسماندگان کی طرح رو پیٹ کر اپنے دھندوں میں دوبارہ لگ گئے اور سیاست داں اقتدار کی ہوس میں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور عیاشی میں پڑ گئے جنہیں نہ قوم کے مفاد سے دلچسپی ہے اور نہ ہی دین و مذہب سے کوئی سروکار۔ کیا زندہ قوموں کی یہی نشانیاں ہوتی ہیں۔؟ پاکستان ان گئے گذرے حالات میں بھی اگر اپنی بقا چاہتا ہے تو اسے اپنی موجودہ خود غرض، عیاش، دھڑے بند اور بدکردار قیادت کو خیرباد کہہ کر متقی پرہیزگار، خوفِ خدا رکھنے والے، انسانیت دوست اور ملتِ اسلامی کا درد رکھنے والے مجاہدین کو اپنی باگ ڈور سونپنی ہوگی جن کا اعتقاد، یقین و بھروسہ اللہ پر ہو (جس وعدہ پر یہ ملک لیا گیا تھا۔) نہ کہ چین روس اور امریکہ پر (جن کے بھروسہ پر موجودہ قیادت کا ایمان ہے) جن کے ہتھیار نہ صرف ٹینک، میزائل و بم ہوں بلکہ اللہ کی مدد بھی جن کے شامل حال ہو اور اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ایسے نڈر و بے لوث اللہ کے بندوں کی کمی نہیں۔ موجودہ حالات کا یہی ایک حل ہے جس کو ابھی تک ہم نے آزمایا ہی نہیں ہے اور اگر اب بھی نہ آزمایا اور نہ اپنایا تو پھر مستقبل بظاہر بہت خطرناک ہے کہ قانونِ فطرت یہی ہے کہ: "اللہ اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتے جو قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔" (بشکریہ ماہنامہ فاران انگلینڈ)

حافظ قاری فیوض الرحمن ایم۔ اے
پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ ایبٹ آباد

مولانا سید محمد ایوبؒ بنوری

پیدائش | آپ ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ بروز چہارشنبہ پشاور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم | ابتدائی تعلیم مقامی پرائمری سکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے چچا مولانا سید فضلِ صمدانی صاحب سے دار العلوم "رفیع الاسلام"[1] میں پانچ سال تک درسِ نظامی کی کتابیں پڑھیں۔

انتہائی تعلیم | ۱۳۴۹ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور برابر تین سال وہیں پڑھتے رہے۔ ۱۳۵۲ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ سے دورۂ حدیث پڑھا۔

تدریسی خدمات | فراغت کے فوراً بعد "دار العلوم رفیع الاسلام" میں تدریس شروع کی اور برابر دس سال تک نہایت محنت و جانفشانی سے پڑھایا۔

دار العلوم سرحد کی بنیاد | ۱۳۷۰ھ میں آپ نے اپنے ادارہ "دار العلوم سرحد"[1] کی بنیاد رکھی۔ (باقی ص ۳۷ پر)

---

[1] یہ دار العلوم پشاور شہر کا ایک ممتاز دار العلوم ہے۔ اس میں تین سو کے قریب طلبہ دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پہلے یہاں کوئی مدرسہ نہ تھا، مسجد ہی میں پڑھائی ہوتی تھی آپکی مخلصانہ کوششوں کی وجہ سے آج یہ دار العلوم ۱۹ کنال کے رقبہ میں ۱۲ بڑے بڑے کمروں پر مشتمل ہے۔ اور ایک شاندار اور وسیع جامع مسجد کی تعمیر بھی ہنوز جاری ہے۔ طلبہ کی کثرت کی وجہ سے یہ عمارت بھی ناکافی ہو رہی ہے۔ مجلسِ منتظمہ نے اس ضرورت کے پیشِ نظر دار الاقامہ کی تعمیر بھی جاری کر رکھی ہے۔ اللہ پاک مولانا موصوف کو دین کی اور زیادہ خدمت کی توفیق بخشے۔ آمین۔ مولانا پاکستان کی معروف علمی شخصیت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری کے ماموں زاد بھائی ہیں۔

قارئین بنام ایڈیٹر

افکار و تاثرات

- بروہی اور علماء
- شراب نوشی اور رشوت ستانی
- امید کی شمعیں
- مساجد اور فرقہ وارانہ سازشیں
- قادیانیت اسلام کیلئے سدِ راہ

مسٹر بروہی اور علماء ملک کی تینوں برسر اقتدار پارٹیوں نے ملک میں اسلامی نظام رائج کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور جب تک موجودہ قوانین کو اسلامی سانچہ میں نہ ڈھالا جائے یہ وعدہ پورا نہیں ہو سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا علماء کرام موجودہ قوانین کو جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی سانچہ میں ڈھال سکتے ہیں یا اس فریضہ کو صرف قانون دان وکلاء ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اس سوال کا عملی اور معقول جواب تو مولانا مفتی محمود کی حکومت نے یہ دیا کہ علماء اور قانوندان ہر دو حضرات پر مشتمل ایک آئین ساز کمیٹی قائم کرنے کا اعلان کیا تاکہ جدید تقاضوں کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین کی وسعت اور گہرائیوں کا پورا لحاظ رکھا جا سکے۔ مگر تعصب، حسد اور جہل سے بھرپور جواب ہمارے ایک بڑے قانون دان مسٹر اے کے بروہی نے خیبر کالج پشاور میں یہ کہہ کر دیا کہ علماء موجودہ قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور یہ کہ علماء چند مسائل کے علاوہ کچھ نہیں جانتے کیونکہ یہ چند تفاسیر پڑھنے پر اکتفاء کرتے ہیں ـــــ بروہی صاحب کے اس بیان پر ملک میں بجا طور پر تعجب ہو رہا ہے۔ فرنگی دور نے علماء اور مسٹر طبقہ میں جو نفرت اور بعد پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ بروہی صاحب نے اس حربہ سے کام لیکر علماء دشمنی اور بے جا پندار اور نخوت کا مظاہرہ کیا۔ اگر علماء چند تفاسیر و احادیث کی کتابوں کی بناء پر یہ صلاحیت نہیں رکھتے تو بروہی صاحب جیسے لوگوں کو تو چند ایسی کتابیں بھی نہیں بلکہ ان کے غلط سلط تراجم اور وہ بھی مستشرقین کے ترجمہ کئے ہوئے معلومات پر اسلامی قانون کی ترجمانی کا حق کس طرح مل سکتا ہے۔ اس وقت چاہیئے کہ قدیم و جدید میں منافرت پیدا کرنے والی باتوں سے احتراز کریں۔ اگر بروہی صاحب یہ کہتے کہ قانون سازی کا یہ کام علماء اور وکلاء کو باہمی تعاون سے کرنا چاہیئے۔

تو یہ بات انکی شہرت اور نیکنامی سے جوڑ کھاتی مگر اب تو ان کی "اسلام پسندی" کا بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔ (صاحبزادہ محمد صدیق حقانی الازہری پاڑا چنار)

شراب نوشی اور رشوت ستانی | گذشتہ شمارہ میں آپ نے شراب کے متعلق لکھا، پڑھ کر از حد خوشی ہوئی، تمام علماء کرام کو چاہئے کہ وہ اس موذی لعنت جو ہمارے عوام وخواص میں عام ہو گئی ہے، کے خلاف ایک تحریک چلائیں تاکہ اگر اس لعنت کو ختم نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم اس کے خلاف نفرت پیدا ہو اور لوگوں کو اس کے استعمال کے روحانی، جسمانی، مذہبی ——— نقصانات کا علم ہو سکے۔ بلکہ علماء کرام کو چاہئے کہ یہ معاملہ حکومت کے سامنے پیش کریں اور اس پر پابندی کے احکامات جاری کروائیں۔ اس کی تیاری، خرید و فروخت خورد و نوش پاکستان کی حدود کے اندر بند کروائی جائے۔ ہمارے معاشرے میں، شراب نوشی سے بڑھ کر ایک اور زیادہ خراب بیماری پھیل گئی ہے جسکا تعلق عوام الناس سے بھی ہے یہ شراب کے مقابلہ میں زیادہ مضر اور نقصان دہ ہے۔ اس کو رشوت ستانی کہتے ہیں۔ اس کا رواج گذشتہ دس بارہ برسوں میں اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ اب رشوت لینے والے اس کالی کمائی کو حرام نہیں سمجھتے بلکہ اسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہ صرف سرکاری محکموں میں ہی نہیں بلکہ عام فیکٹریوں، کارخانوں کاروباری اداروں حتیٰ کہ دوکانداروں میں بھی عام پائی جاتی ہے۔ اس کے نقصانات شاید شراب کے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں، وہ اس لئے کہ شراب کو عوام یا خواص خاص خاص موقعوں پر پیتے ہیں، لیکن رشوت تقریباً ہر جگہ ہر شخص ہر وقت کھاتا ہے۔ سمجھتے ہوئے بھی اور نا سمجھتے ہوئے بھی۔ اور جو شخص رشوت نہیں کھاتا۔ رشوت خور اسکی زندگی کا حاشیہ تنگ کر دیتے ہیں۔ وہ کسی جگہ بھی کامیاب نہیں ہوتا، رشوت سے سالوں اور مہینوں کا رکا ہوا کام منٹوں سیکنڈوں میں ہو جاتا ہے۔ اور رشوت نہ دینے والے کو اتنا پریشان ہونا پڑتا ہے جو بیان سے بھی باہر ہے میں یہاں اس کے اثرات بد یا نقصانات نہیں گنوانا چاہتا بلکہ صرف اتنا بتا دیتا ہوں بس قوم میں رشوت کا رواج پا جائے اس میں ایمان، ہمدردی، استقلال، جرأت، ہمت صبر و تحمل جیسی خوبیاں ناپید ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی کمی سے اس قوم کے زوال کا باعث بنتی ہے۔ رشوت خور کو ملک اور قوم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ صرف اپنی ذات، جیب اور مفاد سے واسطہ ہوتا ہے۔

جو شخص رشوت نہیں لیتا۔ اس کے افسران بالا، والدین، بیوی بچے حتیٰ کہ واقف کار

بھی اس سے ناخوش رہتے ہیں۔ کیونکہ رشوت نہ لینے والے کی وہ صرف تنخواہ رہ جاتی ہے اور ایسا شخص جو رشوت نہیں لیتا، کو دفتر کے چپڑاسی پانی تک پلانا بھی گوارہ نہیں کرتے جبکہ اس کے برعکس رشوت لینے والا اپنے افسران بالا کو بھی خرید لیتا ہے۔ چنانچہ اندریں حالات میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آپ رشوت ستانی کے خلاف اپنے مجلہ میں مضمون لکھیں اور ایک تحریک چلائیں کہ ملک اور قوم سے رشوت ستانی دور کی جائے۔ اس کے نقصانات مذہبی نقطۂ نظر سے بیان کریں۔ رشوت خوروں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں۔　　شیخ محمد اسلم۔ ایم۔ اے۔ انگلش و اردو اے ایم آئی ٹی (لندن) شاہدرہ ٹاؤن لاہور

*

جمعیۃ العلماء کی حکومت اور امید کی شمعیں | سرحد میں شراب پر پابندی کی خبر پڑھ کر بے حد مسرت کا احساس ہوا۔ اس ایک معتدل اور حق افروز قدم نے کتنی ہی روشن منزلوں کی طرف نگاہوں کا رخ موڑ دیا ہے، یقین جانیئے لاتعداد دلوں میں امید و اطمینان کی کتنی ہی شمعیں روشن ہو گئی ہیں۔ مدت کے بعد اس خطۂ زمین کے ایک گوشے میں علماء کرام کے اقتدار کا تخت بچھا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ لوگ اس مسند زرنگار پر حق و صداقت اور اسلام کی ضیائے عالم تاب کی حکمرانی دیکھنا چاہتے ہیں۔ صوبہ سرحد میں علم و فضل کی عظمتیں ایک دور امید و آزمائش کی کربلا سے گذر رہی ہیں اگر وہاں ایک اسلامی معاشرہ کے خدوخال واضح اور نمایاں ہوں گے تو ناممکن نہیں کہ لامذہبیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے قدم رک جائیں۔ موجودہ نسل، جس کے دل و دماغ، تشکیک کے کانٹوں سے بری طرح مجروح ہیں۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کو عملی صورت میں جلوہ گر دیکھنا چاہتی ہے۔ اس دیرینہ تشنگی کی سیرابی کا شرف پہلی بار صوبہ سرحد کو ملا ہے۔

آپ حضرات کی راہ میں رکاوٹوں اور مشکلات کی لاتعداد دیواریں کھڑی ہیں۔ ہمارے معاشرے کا مرض اتنا قدیم اور پہلودار ہے کہ اس کو ایک صحت مند قالب میں منتقل کرنا کار آسان نہیں لیکن اگر اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کی سربلندی منظور ہے تو آپ بزرگوں کی کوششوں میں وہ ضرور برکت و سعادت کی رنگینی شامل فرمائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ موجودہ حکومت کو نامعلوم کتنی دشواریوں سے گذر کر اپنی منزل تک جانا ہے۔ لیکن بقول علامہ اقبال ؒ

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!　　لیفٹیننٹ کرنل شبیر محمد شاد۔ سیالکوٹ

میں مسجد ہٰذا کے عوام اور جمعیۃ العلماء اسلام کے اراکین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ سب کے دلوں کی تمنا پوری ہوگئی اور ایک عالم الثانی نے اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے وزارت قبول فرمائی، وزیر اعلیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد شراب پر پابندی لگا کر اللہ کے اس حکم کو زندہ کر دیا جسے برسر اقتدار غدار طبقے نے دفن کیا تھا۔ اس خوشی میں بندہ نے مدرسہ عربیہ ہٰذا کے طلباء کو چائے کی دعوت دی اور سب نے تہ دل سے نئی حکومت کی کامیابی کے لئے دعائیں کی گئیں۔　　رسول محمد خوستی - کراچی

مساجد کی الاٹمنٹ یا فرقہ وارانہ کوششیں | بریلوی مسلک کے چند فتنہ انگیزوں نے خفیہ خفیہ یہ کارروائی کی ہے کہ جن مساجد میں بزرگوں کے مزارات ہیں یا بزرگوں کے مزارات کے ملحقہ مساجد ہیں ان مساجد کو بریلوی مسلک کے ائمہ اور خطباء کے لئے مخصوص کیا جائے۔ یہ تحریک ان کی بہت دنوں سے چل رہی تھی، مگر ناکام ہوتی رہی چند دنوں سے ناظم مساجد مرزا منیر احمد نے مسجد دربار نو لکھہ بزاری شاہکوٹ اور مسجد دریا موج بخاریؒ لاہور اور چند دوسری لاہور کی مساجد کے خطیبوں کے متعلق ڈسٹرکٹ خطیب لاہور مولانا اصغر علی اور ڈسٹرکٹ خطیب شیخوپورہ قاری محمد امین کو اس مضمون کی چٹھی بھیج دی ہے۔ کہ مذکورہ مساجد میں جو خطباء ہیں وہ دیوبندی مسلک کے ہیں ان کو وہاں سے تبدیل کیا جائے اور بریلوی مسلک کے لوگ وہاں متعین کئے جائیں اور آئندہ اس قسم کی مسجد میں کوئی دیوبندی امام یا خطیب مقرر نہ کیا جائے اور ناظم مساجد نے اپنی اس چٹھی میں ناظم اعلیٰ اوقاف راجہ حامد مختار کی ہدایت یا امر کا حوالہ دیا ہے۔ اگر اس چٹھی پر عملدرآمد کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کچھ مساجد بریلوی مسلک کے لوگوں کے لئے مخصوص کی جائیں اور باقی مساجد بریلوی اور دیوبندیوں میں مشترک ہوں گی۔ یہ بڑا ظلم ہے۔ کہ محکمہ اوقاف مساجد کو بریلوی اور دیوبندی مسلک میں تبدیل کرتا ہے۔ اور یہ بہت معتمد اور غلط ضابطہ ہوگا۔ کہ کسی بزرگ کے مزار کے ملحقہ مسجد کو بریلوی مسجد قرار دیا جائے۔

(ایک واقف کار)

قادیانیت اسلامی قوانین کیلئے سد راہ بدی | جیسے مذہبی جریدوں میں دین اسلام کے اساسی عقیدہ ختم نبوت کو مفقود و ناپید پا کر مجھے جس قدر کوفت ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ روحانی فرحت اور قلبی مسرت مجھے آپ کے متبرک جریدہ الحق میں اسلام کی اس اساسی کی مکمل تشہیر و تبلیغ

کے ساتھ ساتھ اس کے منکر فرقہ ضالہ مرزائیہ کی گوشمالی و خبر گیری کو پا کر ہوتی ہے۔
یہ بات یہاں ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ یہ مقدس فریضہ اس وقت تک مکمل طور پہ ادا نہیں ہو سکتا جس وقت تک کہ آپ اس بدی کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور وہ بدی ہے۔ عدم تبلیغ ختم نبوت اور سارق روائے ختمیت سے تساہل و تغافل
جب تک ہمارے ملک مملکت خداداد پاکستان میں عقیدۂ ختم نبوت کو شرارۂ و غداران ختم نبوت کی شرارتوں اور شیطنتوں سے حتمی طور پہ مامون و مصئون نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک نفاذ قانون اسلامی ترویج دین حقہ اور اشتہاد و ابلاغ دین میں یہ خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے۔

محمد اقبال کاشغری۔ راولپنڈی

شکریہ و معذرت مخلصین و محبین کی خدمت میں عرض گذار ہوں کہ اہلیہ مرحوم کی وفات پر سینکڑوں ٹیلی گرام اور نامہائے تعزیت موصول ہوئے اور بہت سے اصحاب اخلاص و مودت نے ایصال ثواب کیلئے ختم کئے اور کرائے ان تمام حضرات کا تہ دل سے شکر گذار ہوں حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے سب حضرات کو علٰحدہ علٰحدہ جواب دینے سے قاصر ہوں۔ ان کلمات پر قناعت کرتے ہوئے امید ہے کہ ترک جواب کا مواخذہ نہ فرمائیں گے۔ والسلام

محمد یوسف بنوری۔ مدیر۔ المدرسۃ العربیۃ الاسلامیہ
نیو ٹاؤن۔ کراچی

الحق ادارۂ الحق مرحومہ محترمہ کی وفات پر حضرت مولانا مدظلہٗ کے ساتھ شریک غم ہے۔ اور قارئین و متعلقین دارالعلوم سے مرحومہ کے رفع درجات اور پسماندگان کے صبر جمیل کے لئے دعوات صالحہ کا طلبگار ہے۔

ایک عالم کی وفات مدرسہ تعلیم النساء چشتیاں کے بانی و مہتمم مولانا عبدالجبار صاحب ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ بروز جمعرات بعمر ۶۴ سال انتقال فرما گئے۔ قارئین الحق سے مرحوم کے رفع درجات کیلئے دعا کی اپیل ہے۔ (محمد صالح چشتیاں۔ بہاولنگر)

احوال وکوائف

دارالعلوم

گورنر اور وزیر اعلیٰ سرحد کی آمد | گورنر سرحد جناب ارباب سکندر خان خلیل نے اسلامی مدارس پر زور دیا ہے کہ وہ اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ جدید علوم کی تحصیل پر بھی توجہ دیں۔ گورنر صاحب یہاں دارالعلوم حقانیہ میں شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب ایم این اے کے صاحبزادوں کی تقریب نکاح میں شمولیت کے موقع پر جمعیۃ علماء اسلام کے اکابر اور عمائدین ملک اور معززین کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ گورنر صاحب نے فرمایا کہ میں نے مولانا عبدالحق صاحب سے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ اگر وسائل اجازت دیں تو اسلامی مدارس کی امداد کی جائے انہوں نے اس ضمن میں دارالعلوم حقانیہ کو غیر مشروط امداد دے کر یہاں طب جدید و قدیم کے کھولنے کی پیشکش کی تاکہ یہاں کے فارغ ہونے والے نصاب تعلیم میں ایسے مضامین سے بھی روشناس ہو کر نکلیں کہ دین کے ساتھ ساتھ دنیاوی ترقیات اور مسائل سے بھی مناسبت رکھتے ہوں۔ ہم امداد کے لئے تیار ہیں۔ اختیارات میں کسی قسم کی مداخلت کے بغیر۔

جناب گورنر صاحب نے فرمایا کہ دارالعلوم حقانیہ علم کا ایک ایسا مینار ہے، جسے ہم دنیا کے سامنے پٹھانوں کے دین اور علم سے محبت کی ایک دلیل کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ اور یہ ایک مرد فقیر مولانا عبدالحق صاحب کی فقیرانہ تگ و دو کا ایک زندہ نمونہ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے گورنر صاحب نے کہا کہ وہاں کے بڑے چھوٹوں نے انگریز کے خلاف جہاد میں مسلسل حصہ لیا۔ اور اس سلسلہ میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے رفقاء کے نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔

گورنر صاحب نے تقریر میں صوبہ سرحد کی پسماندگی اور حالات زار کا ذکر کرتے ہوئے اسے ہر طرح مثالی صوبہ بنانے کا عہد کیا۔ گورنر صاحب کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں گورنر صاحب کی آمد کا خیر مقدم کرتے ہوئے نئی حکومت کی کامیابی

کے لئے دعا کی اور یقین دہانی کی کہ وہ علوم جدیدہ اور طب وغیرہ کو دارالعلوم میں شامل نصاب کرانے کے لئے تیار ہیں۔ اور عرصہ سے یہ چیزیں خود ان کے زیر غور ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ مدارس عربیہ کو موجودہ حالات اور تقاضوں کا شدت سے احساس ہے۔ حضرت نے تقریر میں یہ بھی فرمایا کہ خوف خدا ساری حکمتوں کی جڑ ہے۔ اگر یہ چیز دلوں میں آجائے تو ملک میں بغیر فوج پولیس اور طاقت کے مکمل امن وامان ہوسکتا ہے۔ اور معاشرہ بھی درست ہوسکتا ہے۔ بعد میں گورنر سرحد نے دارالعلوم کے مختلف دفاتر اور شعبوں کا بھی معائنہ کیا۔ اور شیخ الحدیث مدظلہ سے دفتر الحق میں تازہ شمارہ پر ان کا آٹو گراف لیا۔

شادی کی اس تقریب میں جو ۱۴ مئی کو ہوئی، صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود صاحب نے بھی کئی وزراء کے ساتھ شمولیت کی۔ بعد میں برات وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمود صاحب کی قیادت میں جہانگیرہ گئی، جہاں مولانا مفتی محمود صاحب نے حضرت شیخ الحدیث کے دو صاحبزادوں حافظ انوار الحق مدرس دارالعلوم اور اظہار الحق کا نکاح پڑھایا۔

گورنر صاحب اور وزیر اعلیٰ کی آمد پر دارالعلوم کے گیٹ پر مولانا سمیع الحق مدیر الحق نے سالار جمعیۃ مولانا عبدالباقی اور جمعیۃ کے زعماء اور اساتذہ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا۔ (بشکریہ ترجمان الاسلام لاہور ۲ جون ۱۹۷۲ء)